UNIVERSAL
LIBRARY

OU_224005

UNIVERSAL
LIBRARY

سید علی محمد موسوی ام۔اے (آخری)
مہتمم مدیر

سید محمد اشہد خاں بی۔اے (عثمانیہ)
مدیر

شعیب اللہ خاں
نائب مدیر

GP—1700—6-11-77—7,000.

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ۸۹۱s ۴۳۰ Accession No. U. 1458

Author مجلہ عثمانیہ

Title مجلہ عثمانیہ حیدرآباد

This book should be returned on or before the date last marked below.

891.430S
Mojallah Osmania

محمد شعیب اللہ خاں
متعلم بی۔ اے

سیّد محمد اسعد حسینی
بی۔ اے (عثمانیہ)

مطبوعہ عہد آفریں برقی پریس۔ حیدرآباد دکن

U.1458

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY HYDERABAD

مجلس انتظامی

سنہ ۱۳۵۱ ف

(صدر)

مولوی قاضی محمد حسین صاحب ام۔اے۔ال ال بی (کنٹب)

نائب معین امیر جامعہ عثمانیہ

CHECKED 1965

مشیر حصہ اردو

ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور ام۔اے۔پی ایچ۔ڈی (لندن) پروفیسر اردو جامعہ عثمانیہ

مشیر حصہ انگریزی

پروفیسر ایس کے دوراسوامی بی۔اے (آکسن)۔ام۔اے۔ال۔ٹی لکچرار انگریزی جامعہ عثمانیہ

خازن اعزازی

مولوی وحید الرحمن صاحب بی۔ایس سی۔ پروفیسر طبیعیات جامعہ عثمانیہ

(معتمد)

سید علی محمد موسوی ام اے (آخری) مہتمم مدیر و مدیر حصہ انگریزی

(اراکین مجلس انتظامی)

محمد عاقل علی خاں صاحب بی اے صدر انجمن اتحاد — سید محمد اشہد خاں صاحب بی اے مدیر حصہ اردو

محمد شعیب اللہ خاں صاحب نائب مدیر حصہ اردو — میر حامد علی صاحب بی ایس سی نائب مدیر حصہ انگریزی

مجلسِ مشاورت

مولوی قاضی محمد حسین صاحب ام۔ اے ال ال بی (کنٹب)

نائب معین امیر جامعہ عثمانیہ

(مشیر حصہ اردو)

ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور ام۔ اے۔ پی ایچ۔ ڈی (لندن) پروفیسر اردو جامعہ عثمانیہ

(مشیر حصہ انگریزی)

پروفیسر ایس۔ کے دوراسوامی بی۔ اے (آکسن) ام۔ اے ال۔ ٹی (مدراس)

(خازن اعزازی)

مولوی وحید الرحمن صاحب

بی۔ ایس سی پروفیسر طبیعیات جامعہ عثمانیہ

اطلاع

(۱) تمام مضامین نظم و نثر مدیرین متعلقہ کے نام دفتر مجلہ عثمانیہ کے پتہ پر روانہ کیے جائیں۔
(۲) خریداری اور دیگر امور کے لیے مہتمم مدیر مجلہ عثمانیہ سے مراسلت کی جائے۔
(۳) چندہ کی تمام رقمیں خازن اعزازی مجلہ عثمانیہ کے نام دفتر کے پتہ پر روانہ کی جائیں۔

چندہ

(۱) موجودہ طلبار جامعہ عثمانیہ سے ..... للعہ
(۲) طلبار قدیم و اساتذہ جامعہ عثمانیہ سے ..... صمہ
(۳) عام خریداروں سے ..... ے
(۴) فی شمارہ ..... عاں

سالانہ اخراجات ڈاک حسب ذیل ہوں گے اور بصورت منی آرڈر اخراجات ڈاک میں کمی ہوگی۔
(۱) بذریعہ رجسٹری ایک روپیہ آٹھ آنے کلدار ۱۳ر سکہ عثمانیہ
(۲) بذریعہ سرٹیفکیٹ آف پوسٹنگ اور پہلے نمبر کی وی۔پی کے اخراجات ۱۴ر کلدار ۱۴ر سکہ عثمانیہ
(۳) بذریعہ بک پوسٹ۔ ۹ر آنے کلدار ۶ آنے سکہ عثمانیہ

ارشاداتِ ہمایونی

حضرت بندگانِ عالی مدظلہ العالی

مشورۂ نیک برائے طلبائے عثمانیہ یونیورسٹی

در خیال ما برائے اینہا و دران حصول تعلیم حصہ در امور سیاسی ملک گرفتن (یعنی پالیٹکس) نباشد
نباشد کہ ہیچ نتائج آن و مماثل مقدمات خواہ اندرون ملک باشند یا بیرون بہ وقوع آمدہ
و آن ہم از پیش ایشان پوشیدہ نیست بلکہ عالم آشکارا نظر بر آن این بار الازم کہ قبل اختیار
کردن امورے بر مآلہ و ما علیہ آن نظر غائر بہ دارند تا کہ پشیمانی غلط اقدام دامنگیر ایشاں نہ شود
آرے این ممکن است کہ بعد حصول تعلیم اگر این ہا خود را قابل ثابت کردہ در امور مذکورہ صدر
شرکت بکنند و آن ہم با حزم و احتیاط و ہم با فراست و دانشمندی کہ شیوۂ ہمہ عقلا و
مدبرین جہان است یعنے بلتبی پالیٹکس امضائقہ نباشد بشرطیکہ ہر شے اندرون
حدود معینہ باشد و ہم اختیار کردہ بعد غور و خوض بسیار کہ واقعی راہ نوردی در این
کوچہ پر خار آسان نیست بلکہ خیلے دشوار و ہم ایشان باید دانست کہ بغیر آمد بہار
صبا در چمن جلوۂ خرامی نہ نماید و ہم برطرف دیگر گلہائے نوع بہ نوع تبدیل لباس
نہ کنند تا وقتیکہ لوازمہ بساط گلزار بہ احسن الوجوہ مہیا نہ باشد ورنہ کسے خواہش
نظارہ منظر خوش نخواہد شد و این ہمہ اسباب [illegible] قہرمان قدرت کہ پیدا می نماید
آبیاری و شادابی چمن مفقود نہ شود بلکہ برجائے خود بر پایہ استوار باقی ماند۔

طبع شدہ

در اخبار صبح دکن ششم ماہ ذیعقدہ ۱۳۶۰ ہجری

کلیهٔ مسلّمهٔ دنیا

آنان که در دماغ خود مادهٔ تکبّر و نخوت می دارند یا جلب منفعت پیش نظر ایشان باشد یا خود را عادی زندگی عیش و عشرت ساخته اند یا قلوب ایشان از خدمت بنی نوع انسان خالیست یا از جوهر همدردی و اعانت محروم. هرگز در مقاصد خود کامیاب نمی شوند یا خود را برای خدمت خلق الله اهل ثابت نمی کنند و اصل سبب ناکامی این امور فقدان استقامت مذهب و هم عقاید باشد هم فقدان همت و جرأت در تکمیل امور دنیوی که حق و صداقت چه چیز نسبت ازان یک لخت آن هاناآشنا که نتیجه اش بجز این چیزے دیگر نیست که در راه ظلمت منزل مقصود را تلاش کنان سرگردان می باشند ازین سبب گفته اند که "آب حیوان" را بدست آوردن آسان نیست بجز رهنمائی خضر یا این آن دُرِ شهوار است که در قعر دریا به بطن صدف نشسته است و تا وقتیکه غوّاص جوهر شناوری نه نماید آن در کفش نمی آید که بغیر زحمت نوالهم در دهان نمی رسد

خلاصه اینکه انسان را باید که حتی الامکان اوصاف برگزیده در خود پیدا کرده دعوی نشستن در صف صاحبان ضمیر و کردار به کند ورنه بغیر این شرط دعوی او بلا تامل هیچ وقعت نزد منصف مزاجان یا عقلاے جهان نمی دارد.

به به چه کلیهٔ زرین است!!

طبع شده در اخبار نظام گزٹ یازدهم ذی قعده سنه ۱۳۶۱ هجری

مسئلہ علم و فضل

لاریب کہ این شیئے گران بہاست و صرف در حصہ آن ہا (بہ حصہ رسدی) می آید کہ فطرتاً برائے این "عطیۂ قدرت" مخلوق گشتہ اند و بہ طرف دیگر تکمیل ہمہ امور دینی باشند۔ دُنیوی بر آن منحصر ازین سبب گفتہ اند کہ انسان بغیر علم و فضل و ادراک مافیہا از صفت انسانی متصف نمی شود (در صحیح مفہوم) و ہم خدا و رسول را نمی شناسد و آنچہ فرائیض کہ بر دوش او عاید اند بجائی ایشان ادا و ناممکن تا وقتیکہ معنی رمز اکت آن ہا بہ ذات خود نمی دارد۔

خلاصہ آنکہ این آن شیئے کمیاب ہست کہ در حصول آن تنگ و دو بسیار کرد نیست تا آنکہ او در دامن مراد بہ افتد۔ دیگر از علم و فضل منصب یا منزلت انسان شناخت کردہ شود کہ او چہ پایہ در میان ابنائے جنس یا بنی نوع انسان می دارد۔ اکتساب ضرورت علم و فضل در این دُنیا از حد ضروریت خصوصاً ما ممی ہنیم کہ حالات عالم را چہ تغیر دامن گیر شدہ است و ہم بہ چہ رنگ و افتعات گیتی قلاً با زیان می خورند کہ در این سیلاب صرف اقدام آن گروہ بر جادۂ استقامت می مانند کہ دل و دماغ ایشان از غبیائے علم و فضل منور بہت و ہم آن ہا مادۂ غور و فکر یا بالغ نظری در فن رائے زنی بر امور متوقعہ می دارند ورنہ ممکن نیست کہ از گرداب انتشار ایشان رہائی یابند کہ طوفان باد و باران بہ شدت و مدموم ارسندہ است کہ کشتی بانی بہ پیش این موانعات خیلے دشوار می نماید لہذا ضرورت است کہ بہ عقل و تدبیر کار کردہ زورق را بہ ساحل سلامتی بہ رساند و این خدمت مدبرین یا عقلائے جہان است۔

طبع شدہ و اخبار صبح دکن پنجاہ و ہم ذی قعدہ ۱۳۱۰ ہجری

ارشاد شاہانہ

بتقریب افتتاح نمائش مصنوعات ملکی

"میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ

حالیہ سیاسی فساد اور ہنگاموں میں میری جامعہ کے طلبار نے
جو نظم وضبط قائم رکھا اور موجودہ سیاسی ہلچل میں حصہ لینے سے اجتناب کیا
اُن کا یہ اچھا رویہ دوسروں کے لیئے قابل تقلید ہے
چنانچہ اِس بارے میں ہز اکسلنسی وائسرائے بہادر نے مجھ کو مبارکباد
کا پیام بھیجا ہے۔"

رائٹ آنریبل ڈاکٹر سر اکبر حیدری نواب حیدر نواز جنگ بہادر
کے - ٹی - پی - سی - ڈی - سی - ایل - سابق صدر اعظم دولت آصفیہ و امیر جامعہ عثمانیہ

اِنتساب

سراکبر کی حیات افروز تمناؤں کے نام، جن کے

ثمرِ نورس جامعۂ عثمانیہ کے نونہال ہیں

فہرست مضامین مجلہ عثمانیہ

جلد ۱۵ شمارہ (۳)

سلسلہ نشان	مضامین	مضمون نگار	صفحہ
۱	اداریہ	محمد علی نیّر ایم۔اے (ابتدائی) مہتمم مدیر و مدیر حصہ اردو	الف
۲	رباعی	حکیم الشعرا احمد حسین صاحب امجد حیدرآبادی	۱
۳	سر اکبر خالدہ ادیب خانم کی نظر سے	مخدرہ خالدہ ادیب خانم	۲
۴	شکریۂ احسان	ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب ایم۔اے پی۔ ایچ ڈی	۹
۵	جدید حیدرآباد کا معمار	رحیم الدین صاحب کمال متعلم سال سوم	۱۲
۶	سر اکبر — ماہر مابیات	انوار احمد صاحب صدیقی متعلم سال چہارم	۲۹
۷	آرٹ اور سر اکبر کی زندگی	محمد عبدالقیوم خاں صاحب باقی ایم۔اے (عثمانیہ) اردو لکچرار ادبیات	۵۱
۸	ہندو مسلم مسئلہ سر اکبر کی نظر میں	محمد عبدالحق صاحب متعلم سال چہارم	۶۰
۹	قطعہ	محمد اطہر علی خاں صاحب جاوید متعلم سال دوم	۷۱
۱۰	سر اکبر — مصلح تعلیم	سید محمد یوسف صاحب ناظم متعلم ایم۔اے (ابتدائی)	۷۲
۱۱	سر اکبر اور علمی و ادبی ادارے	خواجہ حمید الدین صاحب شاہد متعلم ایم۔اے (ابتدائی)	۷۹
۱۲	سر اکبر — مدبر	محمد مصلح الدین صاحب صدیقی متعلم سال دوم	۸۷
۱۳	حیدری	مرزا عصمت اللہ بیگ صاحب	۱۰۲
۱۴	لیڈی حیدری	فیض محمد صاحب بی۔اے ایم۔ایڈ (عثمانیہ)	۱۰۳

اداریہ

حیدرآباد کی نشاۃ ثانیہ کا جلیل القدر مجاہد

عثمانیین کا خراج عقیدت

مجلہ عثمانیہ کا یہ خصوصی شمارہ اس عظیم المرتبت، شہرۂ آفاق اور زندۂ جاوید ہستی کی نادر قوت فکر و عمل کے اعتراف میں پیش کیا جارہا ہے، جس کے عدیم النظیر ہمہ گیر تعمیری کارناموں کے نقوش جدید حیدرآباد کی اقتصادی، تعلیمی اور تمدنی تاریخ میں ہمیشہ ابھرتے ہوئے سورج کی کرنوں کی طرح نظروں کو خیرہ کرتے رہیں گے۔

سراکبر کی ذہنی عظمت و بلندی کا اعتراف نہ کرنا، ان کی مہتم بالشان اصلاحی خدمات کو فراموش کر دینا، ان کے اقتصادی و تعلیمی کارناموں سے متاثر نہ ہونا، اہل حیدرآباد کے لئے بالعموم اور عثمانیین کے لئے بالخصوص یقیناً کفران نعمت کے مترادف ہے۔

حیدری نمبر عثمانیین کا ایک خراج عقیدت ہے ——— یہ ایک آئینہ ہے جس میں آپ کو موسس جامعہ عثمانیہ کے اقتصادی رجحانات، تعلیمی تصورات، جمالیاتی احساسات، اور وجدانی کیفیات کا عکس صاف صاف نظر آئے گا ——— مجھے یقین ہے کہ اس شمارہ کے مطالعہ کے بعد سراکبر کی زندگی کی محکم حقیقتوں، بنیادی صداقتوں اور ان کے

نظام فکر کے بہت سے گوشے آپ کے سامنے روشن ہوجائیں گے۔

جامع حیثیات شخصیت

سراکبر کی کتاب حیات میں عزم و ایقان کی ایک کائنات جلوہ آرا ہے۔ انہوں نے مختلف حیثیتوں سے جید رآباد کی خدمت کا جو حق ادا کیا اور کیا بہ لحاظ **ماہر مالیات**، کیا بہ اعتبار **مصلح تعلیم**، کیا بہ حیثیت **علمدار اتحاد** جو آفاق گیر شہرت حاصل کی اور مختلف جامعات و مقامات سے جو اعزازات حاصل کئے وہ ان کے ہم عصروں میں بہت کم ہستیوں کو نصیب ہوئے۔ انھوں نے ہمیشہ **خلوص**، **صداقت** اور **ایثار** کی بنیادوں پر کام کیا، اس لئے ان کے کارنامے انسانی محسوسات کو چھیڑتے ہیں۔ ان کے تدبر و فراست، دور بینی و معاملہ فہمی، سیاسی بصیرت و وسعت نظر نے انہیں مشاہیر عالم کی نگاہوں میں وقیع و محترم بنا دیا تھا۔ ان کا تخیل ایک بحر ناپیدا کنار کی طرح لامحدود تھا۔ ان کی طبع کی جولانیوں اور کارناموں کی رنگا رنگیوں کو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے۔ ؎

"مملکت میں ڈالتا ہے جس طرف کوئی نظر — دیکھتا ہر سمت میں ہے وہ سراکبر کا اثر
کون سا شعبہ ہے وہ جس میں نہیں وہ جلوہ گر — کون سی وہ راہ تھی جس میں نہ تھا ان کا گزر
ایک شخص اللہ اکبر کام کتنے کر گیا
کتنے خالی جام وہ خون جگر سے بھر گیا"

حقیقت یہ ہے کہ سراکبر کی جامع حیثیات شخصیت میں قدرت نے حکیمانہ بصیرت، مجاہدانہ عملیت، فلسفیانہ تصوریت، عارفانہ روحانیت، اور مصلحانہ جرأت کو عجیب حیرت انگیز طریقہ سے سمویا تھا۔ وہ "سخن دلنواز" اور "نگہ بلند" رکھتے تھے۔ اور ان کی جاں "پرسوز" تھی۔ یہی وہ "رخت سفر" ہے جو ایک "میر کارواں" کے لئے ناگزیر ہے۔ وہ مادر اسلام کے سچے سپوت تھے۔ **اسلامی تعلیمات** اور **روایات** نے ان کی شخصیت و سیرت پر پاکیزہ اثر ڈالا تھا وہ انسانی حقوق کے بزرگ ترین محافظ، مساوات کے داعی اعظم اور اخوت کے رفیع الشان

فداکار تھے۔ ان کی وسیع النظری، عالی حوصلگی اور علو ہمتی اسلامی زاویہ فکر کی رہین منت تھی۔

صلح کل مسلک

سراکبر کا مسلک صلح کل تھا وہ معاشرہ کے مختلف طبقوں میں اتحاد و اتفاق کی ایک مستقل تڑپ، یگانگت کی ایک پیہم خلش اور رواداری کا ایک نہ فنا ہونے والا احساس پیدا کرنا چاہتے تھے۔ ہندو مسلم کشیدگی کو وہ ترقی و آزادی کی راہ میں ایک سنگ گراں سمجھتے تھے۔ فرقہ وارانہ تصور حیات کی "چمک" ان کے نزدیک "جھوٹے نگوں" کی "ریزہ کاری" سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ تعصب و تنگ نظری کو وہ انسانیت کے لئے سب سے بڑی لعنت سمجھتے تھے۔

ہندو مسلم تہذیبوں کی **روحانی و اخلاقی** قدروں کا انہیں زبردست احساس تھا، وہ ان مہتم بالشان تہذیبوں کے امتزاج سے ایک ایسی روح کی تخلیق کرنی چاہتے تھے جو ملک کی ہمہ جہتی ترقیوں اور کامرانیوں کی ضامن ہو۔ ان کی ہمیشہ یہ آرزو رہی کہ "تمام اقوام ہند بھائی بھائی کی طرح زندگی بسر کریں"۔ واقعہ یہ ہے کہ اجتماعی زندگی کے عروج و کمال اور استحکام کے لئے معاشرہ کے مختلف طبقوں کے توائے ذہنی و فکری کا ہم آہنگ نشو و نما لابدی ہے اور باہمی اتحاد و ارتباط ہی سے جماعتوں اور قوموں کو حیات جاوید حاصل ہوتی ہے۔

حیدرآباد کا رہنمایانہ موقف

سراکبر حیدرآباد کی نشاۃ ثانیہ کے بلاشبہ جلیل القدر مجاہد تھے۔ جرأت و بیباکی ان کا آئین حیات تھا وہ شراب شوق سے سرشار تھے۔ ان کی یہ دیرینہ تمنا تھی کہ جدید ہندوستان میں حیدرآباد کو ہر حیثیت سے **رہنمایانہ موقف** حاصل ہو۔ انھوں نے اپنے عزم کے تیشے سے عظیم تر حیدرآباد کی تعمیر کی خاطر اختلافات اور بدگمانیوں کے سیکڑوں بت توڑ دیے ——— ناموافق حالات اور ناسازگار فضا کی انھوں نے کبھی پروا نہیں کی ——— نامساعد احوال ان کی آتش عزم کو تیز تر کر دیتا تھا ——— **اندیشۂ طوفاں** ان کے حوصلوں کو کبھی پست نہ کر سکا ——— وہ خطرات کے ہجوم میں اپنے بنیادی مقصد کو

لئے ہوئے بڑھتے ہی گئے ——— قدم ڈگمگانا تو کجا ——— پیشانی پر ہلکی سی شکن تک نہ آئی ——— مختصر یہ کہ ان کی زندگی کا ہر پہلو سمندر کے ضیاء برج کی طرح عزم افزا و یقین آفریں ہے ——— انہوں نے زندگی کی ہر منزل میں بنی نوع انسان کو یہی جامع و ولولہ پرور پیام دیا ؎

بدریا غلط و باموجش در آویز
حیاتِ جاوداں اندر ستیز است

کشمکش انتظار

یادش بخیر! ——— مجلس انتظامی مجلہ عثمانیہ کے اجلاس منعقدہ ۱۷ فروری ۱۳۵۱ف کے فیصلہ کے مطابق موجودہ مجلس ادارت کو حیدری نمبر کی اشاعت کے بعد ماہ مہر ۱۳۵۱ف میں اپنے فرائض سے سبکدوش ہو جانا چاہئے تھا۔ چونکہ اس سال انجمن اتحاد کے تعطل کے باعث جدید مجلس ادارت کے انتخابات غیر معمولی تعویق سے عمل میں آئے، اس لئے مسٹر سید علی محمد موسوی مہتمم مدیر اور ان کے رفقاء کار کو اردی بہشت ۱۳۵۲ف تک کام کرنے کے لئے طویل موقع مل گیا۔ لیکن سات ماہ کی زائد مدت ملنے کے باوجود وہ حیدری نمبر کو منظر عام پر نہ لا سکے ——— کیوں! ——— تفصیلات میں جانے کی یہاں گنجایش نہیں ——— بہرحال اس خصوص میں برادران جامعہ کو کشمکش انتظار سے دوچار ہونا پڑا۔

اردی بہشت ۱۳۵۲ف میں حسب ہدایت عالیجناب نائب معین امیر جامعہ میں نے مسٹر موسوی سے بحیثیت منتخب مہتمم مدیر اپنی خدمت کا جائزہ حاصل کیا۔ جائزہ میں مجھے حیدری نمبر بھی دیا گیا جو ہنوز تشنۂ تکمیل تھا۔ اس طرح مجھے مجلہ عثمانیہ جلد (۱۶) شمارہ (۱) کی تیاری کے ساتھ ساتھ حیدری نمبر کی اشاعت کا بار گراں بھی اٹھانا پڑا۔ تاہم یہ احساس میرے لئے طمانیت بخش ہے کہ اپنے پیشروؤں کی ذمہ داریوں کی تکمیل میرے ہاتھوں ہوگئی۔

تشکّر و امتنان

خاتمۂ سخن سے پہلے مجھے تشکر و امتنان کا فرض ادا کر لینے دیجئے۔ حیدری نمبر کی اشاعت عالیجناب نائب معین امیر جامعہ کی خصوصی توجہات کی رہین منت ہے۔ موصوف اگر اس نمبر کی تکمیل کے لئے مجتمع بچت سے اخراجات منظور نہ فرماتے تو اس کی اشاعت مواز نہ مجلہ عثمانیہ بابتہ ۱۳۵۱ف پر "نمائش مصنوعات ملکی" کے ضمن میں عائد شدہ شدید بار اور دیگر زبردست مصارف کی وجہ سے ناممکن تھی۔

عالیجناب ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور مشیر ادبی حصۂ اردو نے اپنی کثیر ادبی مصروفیات کے باوجود اس نمبر کی اشاعت کے سلسلہ میں جو گتھیاں پیدا ہو گئی تھیں، ان کو سلجھانے میں میری رہبری فرمائی، جس کے لئے میں بہ صمیم قلب شکر گزار ہوں۔

وہ تمام قلمی معاونین بھی شکریہ کے مستحق ہیں جنھوں نے سر اکبر کی حیات اور کارناموں کا تجزیہ کر کے نقد و نظر کا حق ادا کیا ہے۔

ارباب سرپور پیپر ملز بالخصوص مولوی لائق علی خاں صاحب اور مولوی عبدالباسط خاں صاحب کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری ہے کہ انہوں نے حیدری نمبر کے لئے کاغذ کی فراہمی میں امکانی سہولتیں بہم پہنچائیں۔

محمد علی نیّر ایم اے (ابتدائی)
مہتمم مدیر و مدیر حصۂ اردو

رُباعی

عزت نہ ملی کبھی مصاحب ہو کر
بے قدر ہوا ہے قلب، قالب ہو کر
موجود میں، سو عیب نظر آتے ہیں
ہر چیز پسند آتی ہے غائب ہو کر

امجد

سراکبر — خالدہ ادیب خانم کی نظر سے

"نامور ترکی خاتون خالدہ ادیب خانم کی کتاب ان سائڈ انڈیا کے باب شانزدہم کے اُس حصّہ کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے جو سراکبر اور لیڈی آمنہ سے متعلق ہے"

(ادارہ)

سراکبر حیدری ہندوستان میں سب سے ہوشیار ماہر مالیات ہیں۔ نہ صرف حیدرآباد کے موازنے میں آمد و خرچ ٹھیک ٹھیک تلی رہتی ہے بلکہ اس میں فاضلات کی مد بھی قحط کی اتفاقی ضرورتوں کے لئے مختص ہوتی ہے۔ جب مجھ سے اس نادر تدبیر کا ذکر کیا گیا تو میں نے کہا کہ یہ عہد جدید کے یوسف ہوں گے لیکن میں سراکبر سے دارالسّلام میں ملی تو خیال بھی نہ کر سکی کہ انھیں اعداد و شمار، مالیات اور حسابی علوم سے کوئی خاص مناسبت ہوگی مجھے وہ زیادہ تر علمی آدمی معلوم ہوئے اور حقیقت یہ ہے کہ میں نے انھیں تعلیمات کا وزیر خیال کیا۔

سراکبر ساٹھ سال سے متجاوز، ذرا بھاری بدن کے آدمی ہیں اور اکثر یورپی لباس پہنتے ہیں اُن کے اخلاق میں مشرق کی دِلی تواضع کے ساتھ علی اور اثباتی مغرب کی آمیزش ہے۔ آنکھوں میں نرمی اور مہربانی خشخشی گول ڈاڑھی مجموعی طور پر آدمی کو ان کے مشرقی پہلو کا زیادہ احساس ہوتا ہے اگرچہ وہ انگریزی ادبیات میں حیرت انگیز معلومات رکھتے ہیں۔ جو لوگ ان سے واقف ہیں وہ بھی اس معلومات پر شاید حیران رہ جاتے ہیں کیونکہ حیدرآباد کے انگریز ریزیڈنٹ نے کسی قدر تعجب کے ساتھ مجھ سے کہا کہ سراکبر کسی تعلیم یافتہ انگریز کی طرح نہ صرف شیکسپیئر کے اقوال نقل کر سکتے ہیں بلکہ اسی قدر وثوق کے ساتھ ثانوی درجے

کے شعراء کے اشعار بھی۔ اور مالیات میں ان کی ساحرانہ قابلیت پر یہ مستزاد انگریزوں کو ایک بے مثل مرکب نظر آتا ہے۔

میری نظر میں سر اکبر کی بے مثالی دوسری قسم کی تھی۔ میں بہت سے اعلیٰ درجے کے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں سے ملی جن کی انگریزی ادب میں فاضلانہ دسترس تھی اور ہندوستان کی مشرقی تہذیب کے ہندو اور اسلامی دونوں پہلوؤں پر قدرت کاملہ دیکھ کر ہو سکتا ہے کہ آدمی دنگ رہ جائے۔ لیکن اُن لوگوں کی طبیعتوں میں یہ دو پہلو، الگ الگ ہی پائے گئے۔ بعض کا میلان زیادہ ہندو تہذیب کی طرف تھا۔ اور بعض کا اسلامی تہذیب کی طرف اور عموماً ان میں سے کسی ایک کی دوسرے پر فوقیت جتانے کی کوشش کرتے تھے۔ بعض ان دونوں قوموں کو ملا دینے کے قائل تھے یا سیاسی وجوہ سے کسی ایک تہذیب کی جسے وہ درحقیقت ادنیٰ سمجھتے تھے، فقط زبانی ستائش کرتے تھے۔ لیکن سر اکبر بغیر ارادی کوشش کے ایسے کامل امتزاج تک پہنچ گئے تھے اور ہندوستان کی تہذیب کا ایک نادر مرکب اِن کے ذہن میں آگیا تھا۔ اِن کی تعلیمی آرا بھی عاقلانہ اور قابل عمل تھیں۔ ہندوستان میں جس قسم کی بھی یونانی، بدھی، ہندوانی یا اسلامی تہذیب تھی وہ ان کے دماغ میں مجموعی طور پر سمائی تھی۔ حیدرآباد میں غارہائے ایلورہ واجنٹا کے بدھی آثار کی بے نظیر خوبصورتی ان کی نظر میں ایسی ہی عزیز اور قابل فخر تھی جیسے کسی اسلامی عمارت یا کسی صوفی کی تصانیف کی خوبیاں۔ اس طرح اگرچہ عمر کے لحاظ سے سر اکبر گزشتہ نسل سے تعلق رکھتے ہیں لیکن وہ طبیعت کے لحاظ سے مستقبل کے آدمی ہیں اِس واسطے کہ اگر ہندوستان کو ایک قوم کی صورت میں آمیز ہونا ہے تو لازم ہے کہ وہ اپنی کثیر الاوضاع تہذیب و افکار کے اس غیر شعوری امتزاج تک رسائی پالے۔

جامعہ عثمانیہ وہ ادارہ تھا جس سے سر اکبر کو سب سے زیادہ دلچسپی تھی اور مجھے بھی اس کے متعلق اتنا کچھ سننے کا اتفاق ہوا تھا کہ اس کی نہایت مشتاق ہو گئی تھی۔ سر اکبر کی دعوت پر عثمانیہ ہی کے طلبا کے سامنے تقریر کرنے کے لئے میں حیدرآباد گئی اور اُن کے گھر مہمان ہونے والی تھی۔

اس مکان میں آتے ہی آدمی کو وہاں کے حسن مذاق، خوبصورتی اور حسن انتظام کا احساس ہو جاتا ہے اور یہ چیزیں صرف نمائشی حد تک نہ تھیں خواہ نعمت خانہ ہو یا کپڑے دھونے کا کمرہ یا کوئی چھپا ہوا گنجینہ،

گھر کے کونے کونے سے گھر والی کی قابلیت کی شہادت ملتی تھی اور یہاں کی گھر والی لیڈی آمنہ تھیں۔ وہ طیب جی کے خاندان سے تھیں جو بجائے خود ہندوستان میں ایک خصوصیت کی بات ہے۔ ایک زمانہ سے اس خاندان کا ہر فرد کسی نہ کسی شہرت کا مالک رہا ہے۔ اس کی عورتیں مسلمانوں میں سب سے پہلے آزاد ہونے والیوں میں تھیں اور اس کے مرد ہمیشہ ترقی کے حامی رہے۔ آج کل لیڈی آمنہ کی ایک عم زاد بہن بیگم شریف علی دنیائے نسواں میں بین الاقوامی شخصیت ہیں۔ اسی طرح ایک اور عم زاد خاتون موسیقی میں نام پیدا کر چکی ہیں۔

لیڈی آمنہ خود کسی خاص جماعت و فرقے سے تعلق نہیں رکھتیں۔ مزاجاً اُن کے لئے یہ ناممکن ہے۔ اُن کے سامنے آتے ہی آدمی کو جسم و دماغ کے ایک کامل توازن کا احساس ہوتا ہے۔ وہ ایک بلند قامت، خوبصورت بیوی تھیں لباس نک سک سے درست اور گفتار، رفتار یا محض دیکھنے سے آپ اندازہ کر سکتے تھے کہ وہ کامل تناسب قوئی رکھتی ہیں ان میں قریب قریب شاہانہ شان کی بھی کوئی ایسی ادا تھی کہ آدمی کو کسی عالی رتبہ انگریز لیڈی کا، جو اپنے تاریکی خلقے میں رہتی ہو، خیال آتا تھا لیکن انگریز لیڈی کے سامنے اُس کے خانسامان، داروغہ اور نظما ہوتے جو اس کے قصر کا انتظام کرتے۔ بخلاف اس کے یہاں کی تمام جزئیات خود لیڈی آمنہ کے ہاتھ میں تھیں وہ اپنے نوکروں کے جوق کو تن تنہا ہدایتیں دیتیں نگرانی کرتیں اور ہر مجلسی تقریب کا خود انتظام کرتی تھیں۔ اُن میں کوئی ایسی بات ضرور تھی کہ یہ بات تصور میں نہ آتی تھی کہ وہ اپنے اقتدار اور فرض کے کسی حصّہ کو دوسرے کے تفویض کر دیں گی۔ باورچی خانہ سے دیوان خانے تک اور سادہ ترین رسم سے پیچیدہ ترین تقریب تک ہر چیز اُن کی عقابی آنکھ کے اشارے پر چلتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مکان میں کامل وحدت و ہم آہنگی ہو گئی تھی۔ تعجب ہوتا تھا کہ ان سب کاموں کے لئے انھیں وقت کہاں سے ملتا ہے کیوں کہ چائے، دن کے کھانے یا رات کے کھانے پر ہمیشہ مہمان رہتے تھے اور ان سب باتوں کے ساتھ وہ پابندی سے نماز کے پانچوں وقت بھی ملحوظ رکھتی تھیں اور اُن میں جتنا وقت صرف ہوتا ہے اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اسلامی نماز کے آداب سے واقف ہوں۔ ان سب باتوں پر مستزاد یہ کہ دوپہر کے بعد میں انھیں اپنے کمرے میں سینما سیتے یا مطالعہ کرتے دیکھتی تھی۔ پھر یہ کہ ان کے کسی کام میں عجلت نہیں پائی جاتی تھی۔ جس قدر مصروف عورتوں سے میری واقفیت ہے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان سب میں زیادہ فرصت رکھتی ہیں اور اس کا لطف اٹھانا بھی خوب جانتی ہیں۔

میں نے چند مرتبہ یہ ذکر کیا ہے کہ ہندوستان میں ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں کے خدوخال زیادہ واضح ہوتے ہیں۔ لیڈی آمنہ اس کی اعلیٰ مثال تھیں۔ جس طرح ایک بُت تراش بُت کو ہمیشہ کے لئے تراش دیتا ہے انھوں نے اپنی روح کو اسی طرح تراش کر بنایا تھا۔ اس میں حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ ایسے خصائل کی جامع تھیں جو اس وقت تک، کم سے کم ہندوستان میں، مجھے متضاد معلوم ہوتی تھیں۔ یعنی وہ راسخ العقیدہ مسلمان تھیں اور پھر بھی ان میں فرقہ پرستی کا کوئی شائبہ نہ تھا۔ وہ ہندوستان سے محبت کرتی تھیں اور معلوم ہوتا تھا کہ لوگوں کے مذہبی اختلافات سے بالکل بے خبر ہیں۔ اپنے ہم وطنوں کے متعلق ان کی یہ روش دیکھ کر مجھے ایک ترکی سلطان محمود ثانی کا قول یاد آیا۔ "میں اپنی رعایا میں کسی فرق سے آگاہ نہیں، اگرچہ مجھے علم ہے کہ ان میں بعض مسجد میں، بعض گرجا میں اور بعض کسی صومعے میں عبادت کرتے ہیں" وہ غیر اسلامی فنون کی، مثل اپنے شوہر کی دلدادہ تھیں لیکن اس سے اُن کی طبیعت میں کوئی احساس کمتری نہیں پیدا ہوا تھا جو بعض اوقات ہندوستان میں مسلمانوں کی طبیعت کو تلخ کام و مسخ کر دیتا ہے وہ کسی بات پر کبھی جوش میں نہیں آتی تھیں۔ اُن کے معیار بالکل معین تھے۔ وہ ہندومت کے کسی مدّاح کی تقریر یا اسلام کی مذمت مساوی سکوت کے ساتھ سن سکتی تھیں اور اسی درمیان میں وقت آجاتا تو اُٹھ کے نماز کے لئے چلی جاتیں۔

یہ بات کہ اُن کے جذبات میں شدت آسکتی تھی میں نے دو موقعوں پر مشاہدہ کیا۔ ایک تو ہر قسم کے تصوف اور مُفرد رہبانیت خصوصاً اس کی وہ صورت جس میں آدمی بنی نوع سے قطع تعلق کر لیتا ہے اس سے انھیں کمال تنفر تھا۔ اول اول میں نے خیال کیا کہ اس کا سبب یہ ہوگا کہ ہر راسخ العقیدہ مسلمان اس قسم کی رہبانیت سے طبعی کراہت رکھتا ہے لیکن پھر یہ معلوم ہوا کہ اس تنفر کا تعلق خود خاندان میں ایک رنج دہ واقعہ سے تھا یعنی ایک قریبی اور عزیز رشتہ دار تصوف کے اثرات سے فقیر بن گیا اور تھوڑے دن شدید ریاضت کی زندگی بسر کر کے فوت ہو گیا تھا۔ اُن کے جذبے میں آنے والی دوسری مثال میں نے ان کی دوست پرستی کے سلسلے میں دیکھی اُن کی پختہ وفاداری کا یہ مشاہدہ مجھے محض اتفاقی طور پر ہوا اور میں اس کی وجہ سے مدت العمر کے لئے اُن کی مداح ہو گئی۔ اگرچہ وہ ایسی عورت ہیں جو گویا اقتدار کے لئے پیدا ہوئی ہے اور اقتدار انھیں اس طرح من مانا حاصل ہوا ہے جیسے اپنی ناپ کے مطابق دستانہ، لیکن کوئی چیز ایسی نہ تھی جسے وہ اپنی دوستی اور محبت کی خاطر خوشی سے

قربان نہ کردیں۔ شاید یہی بات تھی جس نے انھیں اپنے ذاتی دوستوں میں اتنا محبوب بنا دیا تھا اور جس نے اُن لوگوں کو، جو اُن سے واقف نہیں ہیں، دشمن کر رکھا تھا۔ اُن کے دوستوں میں میں نے دیکھا کہ نوعمر خاص طور پر ان کے گرویدہ تھے گو وہ کبھی اپنی خشک متانت کی وضع نہ چھوڑتی تھیں لیکن یہ نوعمر دوست ان کے ساتھ کمال بے تکلف ہو جاتے تھے۔

وہ عورتوں کے تعلیمی اداروں کی سرپرستی کرتی تھیں اور مجھے بھی زنانہ مدارس میں لے گئیں۔ اِن مدرسوں کا انتظام اچھا ہے، اُن کی صدر انگریز عورتیں ہیں جو اپنے تعلیمی خیالات میں کسی قدر قدامت پسند معلوم ہوئیں۔ یہاں ہندو، مسلمان عورتیں بغیر کسی نسلی یا مذہبی تعصب کے مل جل کر رہتی ہیں۔ ان اداروں میں مجھ پر سب سے زیادہ اثر ایک یتیم خانہ کو دیکھ کر ہوا، جو میرے نزدیک تمام ہندوستان کے لئے صحیح قسم کا ابتدائی مدرسہ ہے۔

اُس رات کھانے پر میں نے اس یتیم خانے کے متعلق چند بحثیں چھیڑیں۔ نصاب چار بولیوں میں کیوں پڑھایا جاتا ہے؟ اگرچہ یہ قدرتی اور مناسب بات ہے کہ ہر بچہ اپنے فرقے کی زبان کی تعلیم حاصل کرے۔ لیکن حیدرآباد میں ایک زبان کا ہونا، جو سرکاری تعلیم کی جاتی ہے، لازم ہے کہ جملہ فرقے باہمی کاروبار یا دوسرے تعلقات کے لئے، اور سب سے بڑھ کر تعلیمی اغراض کے لیے اسے استعمال کریں۔

جس صورت میں کہ ہندو اور مسلمان دونوں گوشت خور ہیں تو وہ الگ الگ کھانا کیوں کھائیں؟ اگر ہندو مسلمانوں کی پکائی ہوئی غذا نہیں کھاتے تو مسلمان ہندوؤں کا تیار کیا ہوا کھانا کھائیں کیونکہ جو مدرسہ اپنے طلبہ کو ایک دوسرے کے اس قدر قریب نہ لاسکے کہ مل کر کھانا بھی نہ کھائیں تو اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ اس ملک میں سچے شہری پیدا کرنے کے مقصد میں ناکام رہا۔

یہ سن کر سراکبر نے سر ہلایا اور معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستان کے حالات سے میری ناواقفیت پر وہ متحیر ہو گئے انھوں نے کہا کہ "ہم مسلمان یہاں حکمران ہیں اور اگر ہم یہ کام کریں تو گویا اپنے اقتدار اور ان بچوں کی بے کسی کا، جنھیں پالنا اور تعلیم دینا چاہتے ہیں، بے جا فائدہ اٹھائیں گے"۔

قدرتی طور پر سراکبر کے شریفانہ خیالات کا میں احترام کرتی ہوں لیکن یہ میری ناواقفیت نہ تھی کہ میں نے اس قسم کے سوال چھیڑے۔ اگر دو رگزشتہ کی طرح آج بھی ہندوستان اس پر قانع ہوتا کہ وہ ایسی ہی

سخت جداگانہ فرقہ بندیوں میں بٹا رہے تو میں ایسی کوئی بات نہ کہتی، لیکن جب سے میں ہندوستان کی سیاحت کر رہی ہوں اور یہاں کے لوگوں سے باتیں کرتی رہی ہوں میں نے دیکھا کہ ہر شخص اتحاد، قومیت اور اہل ہند میں اشتراک عمل اور مستقبل میں آزادی کا تذکرہ کرتا ہے۔ یہ بچے ہندوستان کے لئے ایک دوسرے سے مل کر کس طرح کام کر سکیں گے اور ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں کیوں کر شریک ہو سکیں گے اگر وہ مدرسہ میں یکجا کھانا بھی نہیں کھا سکتے؟ لیکن مجھے اندازہ ہوا کہ انگریزی علاقہ سے دیسی ریاستوں کا حال مختلف ہے۔ یہ بات کہ مسلم اقلیت کسی ہندو اکثریت پر حکمراں ہے اور کہیں کوئی ہندو اقلیت مسلم اکثریت پر، بالکل نئی اور دشوار امور پیدا کرتی ہے۔ تاہم اگر میں کسی ہندو فرمانروا کی ریاست میں ہوتی تو بھی یہی رائے ظاہر کرتی۔ مذہبی محسوسات کا پورا خیال رکھنے کے باوجود بھی یہ ضروری ہے کہ نئی نسل کے لئے ایک مشترک قومی میدان پیدا کیا جائے جہاں وہ ایک مشترک اور آزاد ملک کی جس پر انھیں آئندہ حکومت کرنی ہے، نیو ڈال سکیں۔

ہندوستان میں جامعہ عثمانیہ کا پیہم تذکرہ رہتا ہے۔ جامعہ ملیہ سے پہلے یہی وہ نادر ادارہ تھا جہاں اعلیٰ تعلیم اردو میں دی جاتی تھی۔ اس میں جو دشواریاں ہیں وہ ظاہر میں نظر نہیں آتیں کیونکہ اردو میں اصطلاحی الفاظ اور جدید علوم کی اعلیٰ تعلیم کے لئے مناسب طریق بیان موجود نہیں ہیں اور اُن کو من مانے وضع کرنا بھی ممکن نہیں۔ علمی اصطلاحات مغرب سے لی جاتی ہیں لیکن جب تک خیالات پہلے سے موجود نہ ہوں ادائے مطالب کے اچھے اسلوب نہیں مل سکتے۔ صرف وہ فاضل اور سائنس داں جو اردو کی مصطلحات میں سوچنے کے عادی ہیں علمی اور فلسفیانہ خیالات کو ایک غیر زبان سے اردو میں منتقل کر سکتے ہیں۔ اس غرض کے لئے حیدرآباد کے طلبا پے در پے مغربی جامعات کو بھیجے گئے۔ یہ صرف نوجوان طلبہ نہ تھے کہ امتحانوں کی سند حاصل کریں بلکہ پختہ عمر کے لوگ بھی بھیجے گئے جو سند لینے کے بعد خصوصی تعلیم پاتے اور تحقیقاتی کام کرتے رہے مغرب کی علمی اور فلسفی تصانیف کو اردو میں ترجمہ کرنے کے لئے اب ایک وسیع تنظیم موجود ہے اور یہ کتابیں نصاب تعلیم نیز اسناد دونوں کے لئے ترجمہ کی جاتی ہیں۔

جامعہ عثمانیہ کے اس شاندار کارنامے کا وجود اعلیٰحضرت فرمانروائے دکن کی سرپرستی اور اعانت کا رہین منت ہے معلوم ہوتا ہے حیدرآباد کو علم کا مرکز بنانے میں ممدوح نے پوری توجہ صرف فرمائی

اور بڑی فیاضی سے کام لیا ہے۔ سر اکبر بھی اس کے پُرجوش حامی ہیں اور کوشش کا کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھتے کہ یہ جامعہ اُس درجہ اول سے بھی جو وہ حاصل کر چکی ہے، بلند تر مراتب پر پہنچ جائے۔

خالدہ ادیب خانم

شکریۂ احسان

یہ نظم ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب صدر شعبہ فلسفہ جامعہ عثمانیہ نے رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری
امیر جامعۂ عثمانیہ کے دواعی ڈنر میں پڑھ کر سنائی تھی۔
(۱۹۳۷ء)

بندہ ہوں آزاد، الزام خوشامد سے بری　　بدگماں مانیں نہ مانیں، بات کہتا ہوں کھری
ہے زبانِ حال سے کہتی یہ ہر اک کنکری　　حیدری ہیں حیدرآباد، حیدرآباد حیدری

اس حقیقت کو تو اعدا بھی چھپا سکتے نہیں
اس کے معنی ہیں سر اکبریاں سی جا سکتے نہیں

مملکت میں ڈالتا ہے جس طرف کوئی نظر　　دیکھتا ہر سمت میں ہے وہ سر اکبر کا اثر
کونسا شعبہ ہے وہ جس میں نہیں وہ جلوہ گر　　کون سی وہ راہ تھی جس میں نہ تھا اُن کا گذر

راستوں سے اُن کے نقشِ پا مٹا سکتے نہیں
اس کے معنی ہیں سر اکبریاں سی جا سکتے نہیں

ایک شخص اللہ اکبر، کام کتنے کر گیا　　کتنے خالی جام وہ خونِ جگر سے بھر گیا
ایسا انسان بھی کبھی رخصت ہوا یا مر گیا　　اس سے کیا وہ ملک کے اندر ہی یا باہر گیا

خدمتِ ملت سے خادم کو ہٹا سکتے نہیں
اس کے معنی ہیں سر اکبریاں جا سکتے نہیں

محنتوں سے تیری ویرانے ہوئے ہیں شکر باغ　　تیرے احسانوں سے کتنوں کو ہوا حاصل فراغ

میکدے میں علم و حکمت کے چھلکتے ہیں ایاغ گہری ظلمت میں کیا تہذیب کا روشن چراغ
ظالم اس کو اپنی پھونکوں سے بجھا سکتے نہیں
اس کے معنی ہیں سراکبریاں سے جا سکتے نہیں

عمر کار خیر کی ہے مرد فانی سے فزوں گردش ایام کا چلتا نہیں اس پر فسوں
دوڑتا ہے دہر کی رگ رگ میں یہ مانند خوں کارہت کے ہے آگے چرخ گردوں سرنگوں
زلزلے بھی اس کی بنیادیں ہلا سکتے نہیں
اس کے معنی ہیں سراکبریاں سے جا سکتے نہیں

اہل دنیا ہیں غرض کی جنگ میں گرم ستیز آنے والے کی خوشامد جانے والے سے گریز
آنے والے کی طرف سب دوڑتے ہیں تیز تیز پرتو رفتہ جانے سے ہیں چھوٹے بڑے سب اشک ریز
ہو نہ گھر دل میں تو یوں آنسو بہا سکتے نہیں
اس کے معنی ہیں سراکبریاں سے جا سکتے نہیں

کام کرنے والے کو معلوم ہیں دشواریاں ہیں رموز مملکت میں کتنی دینداریاں
ہر قدم پر ہیں وزیروں کے لئے لاچاریاں ہر کس و ناکس کی کیا دشوار ہیں دلداریاں
بے مثال حیدری اس کو نبھا سکتے نہیں
اس کے معنی ہیں سراکبریاں سے جا سکتے نہیں

مصلحت اندیش تھے وہ نکتہ دانوں کی طرح رہتے تھے بتیس دانتوں میں زبانوں کی طرح
کام پیری میں بھی کرتے تھے جوانوں کی طرح اور سدا رہتے تھے چوکس پاسبانوں کی طرح
بھبکیوں سے ایسے شیروں کو ڈرا سکتے نہیں
اس کے معنی ہیں سراکبریاں سے جا سکتے نہیں

سچ ہے یہ احسان فراموشی کمینوں کا ہے کام عیب بینی، نکتہ چینی، نکتہ چینوں کا ہے کام
حسن پر رکھنا نظر دل کے حسینوں کا ہے کام اور ہدف بننا سدا مردوں کے سینوں کا ہے کام

لوحِ دل سے نقشِ باقی کو مٹا سکتے نہیں
اِس کے معنی ہیں سراکبریاں سی جا سکتے نہیں

"جامعہ عثمانیہ" بے مثل یہ دارالعلوم کر دیا جس نے دکن کو علم و فن کا مرز و بوم
کارنامے جس کے ہیں رشکِ فرنگ و شامِ روم جس کی حکمت اور رواداری کی ہے دنیا میں دھوم
حیدری کو چھوڑ کر ذکر اس کا لا سکتے نہیں
اِس کے معنی ہیں سراکبریاں سی جا سکتے نہیں

کیا جُدا خورشید سے ہوتی ہے سورج کی کرن زندہ تن میں کیا کبھی تن سے جُدا ہوتا ہے من
زندۂ جاوید ہے سچّا عمل، سچّا سخن کیا بھلا سکتے ہیں میری نظم کو اہلِ دکن
واقعہ یہ ہے کہ وہ اِس کو بھلا سکتے نہیں
اِس کے معنی ہیں سراکبریاں سی جا سکتے نہیں

عبدالحکیم

جدید حیدرآباد کا معمار

حرفِ اولین ۔ سر اکبر حیدر نواز جنگ بہادر ان چند ہندوستانی مدبروں میں سے تھے جن کو جدید ہندوستان کی ترقی و تعمیر میں ان کے قلب و دماغ کی بے پناہ صلاحیتوں کے باعث غیر معمولی اہمیت حاصل رہی ہے۔ سر اکبر نے اپنی فکر و بصیرت کے ارث سے حیدرآباد کی قومی زندگی کی تعمیر کے لئے جو جد و جہد کی ہے اس کو تاریخ میں جلی حرفوں سے لکھا جائے گا۔

مشاہیر کی زندگیوں ہی سے قومی تاریخ عبارت ہوتی ہے۔ سر اکبر کی زندگی کے واقعات بیان کرنا جدید حیدرآباد کی تاریخ قلم بند کرنے کے مترادف ہے۔ ان کی زندگی کا مصروف اور بہترین حصہ حیدرآباد کی ہر جہتی سرگرمیوں میں گذرا ہے۔ مرحوم نے خلوص و محبت اور اتحاد و مساوات کو ترقی دینے کے لئے جو جان توڑ کوشش کی اور اس سلسلہ میں انھیں جس ایثار و قربانی سے کام لینا پڑا اس کو آیندہ آنے والی نسلیں شکر گزاری کے ساتھ یاد کریں گی انھوں نے حیدرآباد کی جس اعلےٰ اور بلند نصب العین کی طرف رہنمائی کی ہے وہ ہندوستان کا سب سے بڑا مقصد ہے اگر جدید حیدرآباد کی تعمیر ان ہی خاکوں پر کی جائے جن کو مرحوم کے دل و دماغ کی بے پناہ توانائیوں نے بنا رکھا تھا تو پھر مستقبل میں ہندوستان کی قیادت ارض دکن کی نوجوان نسلوں کے ہاتھوں میں ہوگی۔

ان کے تین گراں قدر اور ان مٹ کارناموں کی وجہ سے انھیں لازوال شہرت حاصل ہے ہر چند اُن کے ان تینوں کارناموں کی اس وقت بھی ستائش کی جاتی ہے لیکن اُن کی پوری اہمیت اور افادیت مستقبل کا موضوع رہی اچھی طرح واضح کر سکے گا۔ سر اکبر نے جامعہ عثمانیہ کو قائم کر کے ہمیں ہمیشہ کے لئے غیر ملکی زبان کی غلامی سے آزاد کرایا۔ ان کے اس کارنامہ کی اہمیت کو اس وقت پوری طرح محسوس کیا جائے گا جب کہ سارے ہندوستان میں

جامعہ عثمانیہ کی تقلید میں مادری زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دیا جائے گا۔ سر اکبر کی زندگی کا اس کے بعد دوسرا اہم اور لاجواب کارنامہ مالیاتی تسہیل بندی ہے۔ اس طریقہ کو ایجاد کر کے سر اکبر نے حیدرآباد کی مالیات کو مستحکم بنیادوں پر قائم کرنے کی جو کوشش کی ہے اسے بھی حیدرآباد کی تاریخ میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس کے بعد سر اکبر کا تیسرا کارنامہ جس کی بدولت انھیں ہمیشہ کی زندگی نصیب ہوئی وہ ان کی اصلاحات والی اسکیم ہے۔ اس اسکیم کے متعلق ان کی سیاسی حکمت عملی کے سخت بہت کچھ لکھا جا سکے گا لیکن یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ یہ ہندوستان کے حالات اور سیاسی رجحانات کا لحاظ کرتے ہوئے فرقہ وارانہ مسئلہ کا ایسا موثر حل ہے کہ اس اسکیم کو عملی جامہ پہنا کر سارے اختلافات دور کئے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ ایک سیاسی کارکن نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اس اسکیم کے متعلق بالکل درست کہا تھا کہ یہ بادشاہت اور ترقی پسندانہ جمہوریت کا بہترین امتزاج ہے۔ اس دستور کے ذریعہ مستقبل کے رجحانات اور تحریکات کا دامن ماضی سے باندھ دیا گیا ہے۔ زندگی کی دوڑ میں ماضی کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ حیدرآباد کی حد تک ہندوستان کا صحیح معنوں میں رہنما اور قائد ہندوستان کے بدلتے ہوئے حالات میں سر اکبر کی ہمہ گیر اور ممتاز شخصیت نے جو بلند اور نمایاں جگہ حاصل کی تھی اس کو دیکھنے والوں نے نگاہ کے مختلف زاویوں سے دیکھا۔ زاویوں کے اختلاف کے ساتھ ان کی شخصیت بھی مختلف نظر آئی اسی لحاظ سے ان کے متعلق جدا جدا تصورات بھی قایم کئے گئے۔ لیکن اس قسم کی چیزوں کا سر اکبر کی شخصیت پر بہت کم اثر پڑا۔

ہندوستان کی یہ سب سے بڑی بدقسمتی ہے کہ وہ اپنے محسنوں اور حقیقی خدمت گزاروں سے واقف نہیں ہے سیاسی شورشوں اور مذہبی ہنگاموں کے شور و غل میں ایسے افراد کو نمایاں ہونے کا موقع مل جاتا ہے جو اپنی ریاکارانہ قیادت کے کوڑھ کو حب وطن اور مذہب پرستی کے خوش وضع لباس میں چھپانے کی کوشش کرتے ہیں اور ہمیشہ اس امر کے لئے کوشاں رہتے ہیں کہ ایسے افراد کو کام کرنے کا موقع ہی نہ ملے جو خلوص اور نیک نیتی سے قوم کی خدمت کے فرائض انجام دینا چاہتے ہیں تاکہ ان کی ریاکاری کی خلوص و ایثار کے تیروں سے پردہ دری نہ ہو جائے۔

سر اکبر کی زندگی کے حالات کا مطالعہ کرتے وقت اس امر کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ وہ آئندہ پیش آنے والے واقعات کی تصویریں بہت صاف دیکھ سکتے تھے۔ ان کی نظریں کبھی عارضی بہتری کے لئے بے تاب نہ رہتی تھیں بلکہ ہمیشہ ان کے سامنے مستقل ترقی ہوتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اُن کے کارناموں کی بنیادیں ترقی پسندانہ بنیادوں

پر قائم ہیں۔

سراکبر کی شخصیت کا ایک اور نمایاں پہلو یہ تھا کہ وہ جس شعبہ میں بھی مامور کئے گئے انھوں نے محنت و جفاکشی سے اپنے مفوضہ امور انجام دیئے۔ وہ کبھی اپنے پیش روؤں کے بندھے ہوئے طریقوں پر عمل نہیں کرتے تھے بلکہ ہمیشہ ایسے طریقوں کی طرف رہنمائی کرتے جو زیادہ سے زیادہ مفید اور کارکردگی میں اضافہ کرنے کا باعث ہو سکتے تھے چنانچہ سراکبر کی زندگی کے ابتدائی حالات سے آخری زمانے کی کارگزاری تک یہ خصوصیت نمایاں رہی وہ نہ صرف غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے بلکہ اس کے ساتھ ہی ان کو محنت و جفاکشی کی بھی عادت تھی۔

سراکبر کو جامعہ عثمانیہ سے والہانہ محبت تھی۔ ان کی دلی تمنا تھی کہ جامعہ کے تعلیم یافتہ ہر شعبہ حیات میں سرگرم عمل ہو جائیں۔ سراکبر یہ محسوس کرتے تھے کہ خود ملک میں ایسے اعلےٰ دماغ موجود ہیں جن کی تربیت کی جائے تو وہ ملک و قوم کے لئے مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ سراکبر نے اپنی زندگی میں جامعہ عثمانیہ سے متعلق جو خواب دیکھے تھے مستقبل میں ان کی تعبیریں پوری ہوں گی سراکبر نے حیدرآباد کے حالات اور روایات کا نہایت گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا اس لئے وہ یہاں کے مطالبات سے بھی پوری طرح آگاہ تھے۔ اس کے باوجود کہ ان کا تعلق برطانوی ہند سے تھا وہ اس خیال کے حامل تھے کہ حیدرآباد کی قیادت جامعہ عثمانیہ کے نوجوان پوتوں کے ہاتھ میں ہو۔ چنانچہ انھوں نے سیول سرویس کے ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس جماعت کو قائم کرنے کا حقیقی مقصد یہ ہے کہ حکومت کے اعلےٰ عہدوں کے لئے کارگزار افراد مل جائیں۔ اس وقت جو عہدہ دار بیرون حیدرآباد سے مستعار لئے گئے ہیں ان کا فرض نہ صرف یہ ہے کہ اپنے مفوضہ کام انجام دیں بلکہ ان کے لئے ضروری ہے کہ ملک کے نوجوان طبقہ کو تیار کریں جو ان کی جگہ لے سکے۔

مرحوم امیر جامعہ کی یہ وہ اعلےٰ تمنائیں تھیں جو عثمانین کو ورثے میں ملی ہیں اُن کی زندگی کے واقعات میں ایک سے زیادہ مثالیں ایسی ملتی ہیں جن کو اپنے لئے مشعل راہ بنانا اور اس فکر و عمل کی روح کو اپنی زندگیوں میں کارفرما دیکھنا عثمانین کا فرض ہے جو جدید حیدرآباد کے اس جلیل القدر معمار کی زندگی کا طرۂ امتیاز رہی ہے۔

پیکار زندگی کی ابتداء محمد اکبر نذر علی حیدری بمبئی کے ایک مشہور و معروف تاجر کے گھر ۸ر نومبر ۱۸۶۹ء کو پیدا ہوئے۔ اس خاندان کا تعلق علاقہ کھمبائت سے تھا لیکن اکبر حیدری کے

بزرگوں نے اپنے تجارتی کاروبار کو فروغ دینے کی غرض سے بمبئی ہی میں سکونت اختیار کرلی تھی اس خاندان کے تجارتی تعلقات بہت وسیع تھے۔ ان کے والد نے ایسے زمانے میں چین جیسے دور دراز ملک کے تقریباً چھ سفر کئے جب کہ رسل و رسائل کی کوئی سہولتیں موجود نہ تھیں۔ اس خاندان کے افراد میں بعض خصوصیتیں مشترک ملتی ہیں۔ اس خاندان کے اراکین صدورجہ محنتی جفاکش، چالاک اور جستجو پسند ہوتے ہیں۔ یہ خصوصیتیں سراکبر کو بھی اپنے بزرگوں سے ورثے میں ملی تھیں ان ہی خصوصیتوں کے ہتیاروں سے مسلح ہوکر سراکبر پیکار زندگی میں حصہ لینے کے لئے آئے اور زندگی کے میدانوں میں کامیابیاں حاصل کرتے رہے۔ سراکبر کے والد کی دلی تمنا تھی کہ ان کا لڑکا پڑھ لکھ کر ان کے تجارتی کاروبار کو ترقی دے سکے۔ لیکن یہ کس کو معلوم تھا کہ ان کا لڑکا کچھ اور ہی کام کے لئے پیدا کیا گیا تھا۔ سراکبر کے والد نے اسی خیال سے کہ لڑکا پڑھ لکھ کر کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹا سکے گا ایک انگلو ورناکیولر اسکول میں شریک کیا جہاں انھوں نے انگریزی اور لاطینی زبانوں کی ابتدائی تعلیم حاصل کی اس درس گاہ کے نصاب کو ختم کرنے کے بعد انھوں نے ہائی اسکول میں شرکت حاصل کی۔

سراکبر بچپن ہی سے ذہین اور طباع تھے۔ ان میں اعلےٰ درجے کی دماغی قابلیتیں موجود تھیں اس کے ساتھ ہی وہ محنتی اور جفاکش بھی تھے۔ چودہ برس کی عمر میں جامعہ بمبئی سے میٹرک کا امتحان کامیاب کیا اور جب سترہ سال کے ہوئے تو معاشیات تاریخ، انگریزی ادب اور لاطینی زبان جیسے اہم مضامین کے ساتھ بی اے (آنرز) کی طلبیان حاصل کی۔ یہ ان کے لئے ایک امتیاز تھا کیونکہ اس وقت عام طور پر اٹھارہ سال میٹرک اور بائیس سال بی۔ اے کی کامیابی کے لئے کم سے کم عمریں سمجھی جاتی ہیں۔

سراکبر نے تجارتی کاروبار کی ہماہمی سے معمور فضا میں پرورش پائی تھی اس لئے ان کو تجارتی کاروبار سے فطری لگاؤ ہونا یقینی امر تھا۔ انھوں نے اوّل تو بی ایل میں شرکت حاصل کی اور شاید اس کے پہلے سال میں کامیابی حاصل کی بھی لیکن بعد میں ہندوستانی برطانوی حکومت کے محکمہ مالیہ کے امتحان مقابلہ میں شریک ہوئے اور منتخب کرلئے گئے۔

ملازمت فبروری ۱۸۸۸ء میں سررشتہ حساب کے ایک عہدہ دار کی حیثیت سے سراکبر کو ناگپور پر مامور کیا گیا اس کے بعد ان کو لاہور، کلکتہ، آلہ آباد اور مدراس جیسے مختلف مقامات پر کام کرنے کا موقع

ملا۔ سراکبر نے ہر جگہ محنت و خلوص اور خوش اسلوبی سے اپنے فرائض انجام دیئے۔

برطانوی حکومت نے ان کی کارگزاری کے صلہ میں ان کو ہندوستان کے سرکاری مطبعوں کی نگرانی کا اہم کام تفویض کیا۔ اس عہدہ پر اُن کا تقرر ہونے کے بعد سراکبر کو ملک کے مختلف حصوں میں سفر کرنے کا موقع ملا اس طرح وہ ملک کے حالات سے پہلے کی نسبت زیادہ باخبر ہو سکے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کے سامنے مطبعوں کی نگرانی کیلئے بعض مفید تجویزیں پیش کیں اور حکومت نے ان کو منظور کرلیا۔

سراکبر کو مفاد عامہ کے کاموں سے خاص دلچسپی تھی۔ فطرت کی طرف سے ان کو تنومند اور جدت طراز دماغ عطا ہوا تھا۔ انھوں نے ملک کی ترقی اور اس کی فلاح و بہبود کے مسائل کا نہایت غائر نظر سے مطالعہ کیا تھا اپنی زندگی کے اکثر لمحوں کو ان مسائل ہی پر غور و خوض کرنے میں صرف کیا کرتے تھے۔ غور و فکر کے نتائج کو مفید تجویزوں کی صورت میں ظاہر کیا جس کو چنتامنی نے اپنی کتاب "ہندوستان کی معاشرتی اصلاح" میں دوسرے مشاہیر کے مضامین کے ساتھ شائع کیا۔ اس وقت تک سراکبر کو زیادہ اہمیت حاصل نہ تھی لیکن اُن کے خیالات میں صداقت اور قوت تھی۔ جس کے باعث ہر پڑھنے والے نے اس کے وزن کو محسوس کیا اور یہی وجہ تھی کہ دوسرے ذی علم اور مشہور افراد کے ساتھ سراکبر کے خیالات بھی شائع ہو سکے انھوں نے برسوں غور و خوض کرنے کے بعد ہندوستان کے سیاسی مرض کا ایک ایسا نسخہ معلوم کرلیا تھا۔ جس سے معمولی سا اختلاف بھی نہیں کیا جا سکتا۔ سراکبر کو ہندوستانی معاشرہ کی خرابیوں کا علم راست حاصل تھا۔ ان کو بچپن ہی سے ملک کی فلاح و بہبود کے کام کرنے کا شوق تھا جب دائرہ ملازمت میں ایک عہدہ دار کی حیثیت سے داخل ہوئے تو انھیں ناگپور، لاہور وغیرہ میں مختلف انجمنوں اور اداروں کی سرپرستی کا موقع ملا۔ الہ آباد کے سمیع اللہ بورڈنگ ہوز سے سراکبر کو جو وابستگی تھی وہ ہمیشہ یاد رہے گی۔

اس عرصہ میں سراکبر حیدری کا بیاہ ہو چکا تھا اور اُن کی چچازاد بہن آمنہ حیدری جو نجم الدین طیب جی کی پانچویں بیٹی تھیں سراکبر کی شریک حیات بنیں۔

حیدرآباد کی ملازمت ۱۹۰۵ء میں حضور نظام غفراں مکاں نے برطانوی حکومت سے خواہش کی کہ کسی ایسے کارگزار محاسب کی خدمات مستعار دی جائیں جو ملک کے مالیہ کی تنظیم و اصلاح کر سکے برطانوی حکومت ہند نے سراکبر کی خدمات اور کارگزاری کا لحاظ کرتے ہوئے انھیں حیدرآباد روانہ کیا۔ سراکبر نے

راجہ مری منوہر آصف نواز دنت سے ۱۶ آذر ۱۳۱۵ف کو اپنی خدمت صدر محاسبی کا جائزہ حاصل کیا۔ اس کے فوراً ہی بعد تمام صیغوں کے طریقہ کار میں اصلاحیں شروع کیں کھٹادتی مداخل اور مخارج کے رجسٹروں پر تنقیدی نظر ڈالی اور اس طرح سررشتہ کی تنظیم کے بعد ملازمین کے تقرر کے لئے بھی امتحان مقرر کیا اور ہر اس تجدیدی ہمہوت کو جو ملک کی ترقی کے لئے مفید ہو سکتی تھی اختیار کیا اس کے ساتھ ہی کساد بازاری کے اثرات کو کم کرنے کے لئے حکومت کی طرف سے مختلف اسکیمیں جاری کیں اس کے بعد سے آخری عمر تک صرف تھوڑے عرصہ کو اگر نظر انداز کر دیں تو ان کا تعلق حیدرآباد سے رہا اور متعدد محکموں کے کارگزار عہدہ دار اور ذمہ دار وزیر مالیہ و صدر اعظم کی مختلف حیثیتوں میں ملک کی ہر جہتی ترقی میں حصہ لیتے رہے۔ کوئی تحریک ایسی نہ تھی جس کے روبہ عمل لانے میں ان کا مشورہ شامل نہ رہا ہو۔ اس لئے یہ کہنے میں کچھ مبالغہ نہیں کہ سراکبر کے تذکرہ کے بغیر حیدرآباد کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔

سراکبر کو کام کرنے کا حیدرآباد میں بہت کافی موقع ملا۔ کچھ تو اس لئے کہ یہاں محکموں کی حالت غیر منظم تھی اور دوسرے خود سراکبر کی جدت پسند طبیعت اس امر کی کوشاں رہتی تھی کہ محکموں کی کارکردگی کو زیادہ سے زیادہ موثر بنایا جائے۔ جس زمانے میں سرجے سی واکر انگلستان میں تھے سراکبر نے اپریل سے اکتوبر ۱۹۰۶ء تک معتمدماليات کے فرائض انجام دیئے اور اس محکمہ کی کارگزاری کو بڑھایا یہ مدت بھی سراکبر کی جدت پسند طبیعت کے لئے کافی تھی چنانچہ انھوں نے اس مختصر سے وقت میں محکمہ کے مختلف شعبوں کی اصلاحیں کیں۔

حیدرآباد میں معتمدی امور عامہ سب سے زیادہ اہم اور ذمہ دار خدمت ہے ایک سے زیادہ محکمے اس معتمدی سے متعلق ہیں اور ان سب کی حیثیت تعمیری ہے۔ خصوصاً تعلیمات کا محکمہ کسی ملک کی ترقی میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ملک کی یہ خوش قسمتی تھی کہ سراکبر جیسا بیدار مغز اور تعلیمی امور سے دلچسپی رکھنے والا شخص امور عامہ و تعلیمات کی معتمدی پر فائز ہوا۔ یہ وہ زمانہ ہے جس کے بعد سراکبر کو شہرت حاصل ہوتی ہے۔ یہ شہرت اور نیک نامی دراصل سراکبر کے پرخلوص کاموں کی پرچھائیں ہے ایک طرف تو ملک میں تعلیم کی روشنی کو عام کرنے کا بیڑہ اٹھایا اور دوسری طرف ملک کے بہترین دماغوں کی تربیت کا انتظام کیا تاکہ وہ ملک کی خدمت انجام دے سکیں۔

سراکبر یوں تو محکمۂ مالیات کے ماہر تھے۔ لیکن ان کو تعلیمی معاملات سے بھی گہری دلچسپی تھی اور اس کے علاوہ سراکبر ان افراد سے بخوبی واقف تھے۔ جن سے کام لیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ اس زمانہ میں حیدرآباد کے محکمۂ تعلیمات کی اصلاح

اور تنظیم کے لئے مسٹر کی خدمات برطانیہ علمی سے مستعار حاصل کرنے کی تجویز کی۔

جامعہ عثمانیہ

ایک عرصہ سے سراکبر کا یہ خیال تھا کہ ہندوستان کی تمام جامعات کی تعلیم در اصل تمام خرابیوں کا باعث ہے اس لئے وہ چاہتے تھے کہ علم و معارف کا ایک ایسا مرکز قائم کریں جہاں ملک کے حالات اور روایات کے مطابق تعلیم دی جاسکے۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے سراکبر کو جن دشواریوں اور مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے جامعہ کے قیام سے پہلے مدارس کی ضرورت تھی۔ چنانچہ اس سلسلہ میں سراکبر حیدری کو جو کامیابی نصیب ہوئی اس زمانے کا ایک ان مٹ کارنامہ ہے ایسی جامعہ کو کامیاب بنانا جس کا ذریعہ تعلیم ہندوؤں اور مسلمانوں کی قومی مشترکہ زبان اردو ہو کوئی آسان کام نہ تھا کیونکہ اول تو اس زبان کا علمی سرمایہ بہت ہی کم تھا دوسرے یہ اپنی نوعیت کا سب سے پہلا تجربہ تھا۔ اس جامعہ کو قایم کرنے کی نہ صرف مسلمانوں نے حمایت کی بلکہ اس سلسلہ میں ملک کے ہندوؤں نے بھی اس کی پُرزور تائید کی ملک میں ایسی ہمت افزا فضا پیدا ہو گئی جس کے باعث اس نوعیت کے تجربہ میں کامیابی کے زیادہ امکانات تھے۔ وہ تمام تحریکیں جو کبھی عماد الملک مرحوم کے دماغ میں پرورش پا رہی تھیں سراکبر حیدری کی سعی و کاوش سے بارآور ثابت ہوئیں۔ ایجوکیشنل کانفرنس کے پہلے اجلاس میں سراکبر نے صدارتی تقریر کرتے ہوئے کہا تھا "خدا نے چاہا تو چند سال ہی میں دارالعلوم ایک عظیم الشان یونیورسٹی ہو جائے گا جس کی نظیر ہندوستان بھر میں نہ ہوگی اور جس کا فیض دور دراز تک پہنچے گا اور لوگ ملک ملک سے استفادہ کرنے کی غرض سے حیدرآباد آئیں گے" سراکبر نے اس تجویز کو روبہ عمل لانے سے پہلے ہندوستان کے قابل فخر اور ممتاز افراد سے مشورے طلب کئے ڈاکٹر گوروآنجہانی نے نہ صرف ان کے خیالات اور یونیورسٹی کے تکمیل کی ستائش کی بلکہ اس کے ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ "اس تمام تجویز میں جس چیز پر اعتراض ہو سکتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ ابتدا ہی میں آپ کے ارادوں میں اس قسم کا شک و شبہ نہ ہونا چاہیئے اور آپ کو عزم بالجزم کے ساتھ ان دشواریوں اور رکاوٹوں سے گزرتے ہوئے آخری منزل تک پہنچ جانا چاہیئے ہمارا عقیدہ قوی رہے چونکہ ہماری راہ میں بڑی بڑی مشکلیں حائل ہیں" ان کے علاوہ بھی دوسرے ممتاز افراد نے اس جدت کی ستایش اور تائید کی۔

سراکبر کو جہاں ملک اور بیرون ملک کے مقتدر افراد کی تائید حاصل ہوئی خسرو دکن نے بھی فرمان کے ذریعہ اس کی منظوری دے کر اپنے نام کو اس جامعہ کے ساتھ وابستہ فرمایا۔ چنانچہ ارشاد خسروی ہے کہ "میں بہت

خوشی کے ساتھ اجازت دیتا ہوں کہ میری تخت نشینی کی یادگار میں حسب متذکرہ اصول محولہ عرضداشت کے موافق ممالک محروسہ کے لیے یونیورسٹی قائم کرنے کی کارروائی شروع کی جائے اور اس یونیورسٹی کا نام عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد ہوگا۔"

سر اکبر نے جامعۂ عثمانیہ کو قائم کرکے ایک ایسا گراں قدر کارنامہ سرانجام دیا ہے کہ ان کا نام جامعہ کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ وابستہ رہے گا۔ اس جامعہ کے ذریعہ صحیح معنوں میں ملک کو پردیسی زبان کی غلامی سے آزاد کرنے کی پہلی مرتبہ کوشش کی گئی ہے۔ جن کی تمام ملک میں تقلید کی جائے گی۔ زبان کو علمی بنانے اور اس کے سرمایہ میں وسعت دینے کے لئے مجلس اصلاحات اور دارالترجمہ کا قیام عمل میں آیا جہاں دنیا کی تمام زبانوں سے مفید کتابوں کا ترجمہ اردو میں کیا جاتا ہے۔ تاکہ اس طرح علمی سرمایہ میں اضافہ ہو۔

سر اکبر نے نہ صرف جامعہ عثمانیہ کو قائم کیا بلکہ اس کے ساتھ ہی ملک میں ایک خاص تعلیمی حکمت کو روبعمل لانے کی کوشش کی تاکہ ملک کی خوشحالی میں اضافہ اور تجارتی ترقی کے لئے نئی راہیں کھل جائیں۔ ان کا خیال تھا کہ ملک کے تعلیمی نظام میں اصلاحیں ضروری ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی کے سالانہ جلسہ تقسیم اسناد میں انھوں نے جو خطبہ ۱۹۲۵ء میں پڑھا اس میں ان خیالات کا اظہار کیا ہے۔ جو ایک عرصے سے ان کے دماغ میں پرورش پا رہے تھے ان کی پیش کی ہوئی تجویزیں۔ ملک اور وقت کی ضرورتوں کو پورا کرتی ہیں۔ سر اکبر نے کہا تھا کہ "موجودہ تعلیمی نظام کے تینوں درجوں میں سے ہر ایک درجہ آئندہ کے لئے تیاری کا کام دیتا ہے۔ اور اگر کوئی چاہے کہ کسی درجے کے ختم پر روزگار حاصل کرے تو اسے کامیابی نہیں ہوتی کیونکہ یہ تعلیمی درجے خود مکتفی نہیں ہیں۔ اس لئے ایسا نظام اختیار کیا جائے کہ ان میں سے ہر ایک درجہ حصول مقصد کا ذریعہ بن سکے۔ یعنی یہ کہ ایک درجہ ختم کرنے کے بعد طالب علم اس قابل ہو کہ اگر وہ چاہے تو عملی زندگی میں قدم رکھ کر اپنی حیثیت کے مطابق روزگار حاصل کرسکے سر اکبر نے نصاب کی جگہ لازمی تعلیم پر زور دیا۔ اس میں ہر علم کی ضروری اور ابتدائی معلومات شامل ہوں۔ تاکہ اس طرح ہر شہری کو اس کا تعلق خواہ کسی پیشے سے ہو ملک کے معاملات سمجھنے کے قابل بنایا جاسکے۔ ان کا خیال تھا کہ محض نظری تعلیم مفید نہیں ہوسکتی بلکہ اس کے پہلو بہ پہلو عملی تعلیم کا بھی انتظام کیا جائے۔ کوئی ایک درجہ ختم کرنے کے بعد اگر طالب علم چاہے تو روزی کمانے کے قابل ہو یا آئندہ تعلیم جاری رکھ سکے۔

اس ابتدائی نصاب کی تکمیل کے بعد طالب علم اپنی طبیعت کی مناسبت سے اگر اس کے حالات اجازت دیں تو ثانوی تعلیم حاصل کرنے کے قابل ہو سکے گا۔ اس درجہ میں خاص طور پر فنی یا صنعتی، تجارتی یا کسی اور پیشہ کی تعلیم پر زور دیا جائے گا۔ سر اکبر نے تیسرا درجہ جامعہ کی تعلیم کو قرار دیا ہے۔ سر اکبر کا خیال تھا کہ تیسرے درجے کو جامعہ کہنے کے بجائے فرانس کی طرح ملک کے تمام نظام تعلیم پر اس کا اطلاق ہونا چاہئے۔ اس لئے ان کی تجویز تھی کہ جامعہ کے تحت ان تینوں درجوں کو شامل کر لیا جائے۔ اس طرح ایک ہی عاملہ جماعت کی نگرانی میں ملک کا انتظام ہو سکے گا ان کا خیال تھا کہ اس سے ملک کی بیروزگاری کے مسائل کو بھی کامیابی سے حل کیا جا سکے گا۔ کیونکہ ہر شعبہ میں جتنے افراد کی ضرورت ہوگی اس سے زیادہ اس شعبے کی تعلیم حاصل نہ کر سکیں گے۔ اور قومی زندگی کے مختلف شعبوں میں توازن پیدا کر سکیں گے۔

سر اکبر نے انھیں تصورات کے پیش نظر حیدرآباد کے تعلیمی نظام میں بھی تبدیلیاں کرنی چاہئیں۔ چنانچہ میکنزی مرحوم کی اسکیم جس کے ایک حصہ کو ناکام طریقہ پر اختیار کیا گیا ہے۔ سر اکبر کے خیالات ہی کو عملی جامعہ پہنانے کے لئے پیش کی گئی تھی۔ اس اسکیم کے متعلق بحث و مباحثہ کی تمام منزلیں اگر سر اکبر کی زندگی ہی میں طے ہو جاتیں تو پھر ملک کو ترقی کرنے کے لئے مفید راہیں مل سکتیں۔ اس اسکیم کی ناکامی کا اصل سبب یہ تھا کہ ارباب جامعہ اور تعلیمات کے عہدہ داروں میں کوئی ربط نہیں پیدا کیا گیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب اس اسکیم کو منظور کرنے کے بعد ارباب جامعہ کے سامنے پیش کیا گیا تو یہ لازمی تھا کہ اس سے اختلاف کیا جاتا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور ایک ایسی اسکیم سے ملک کے فائدہ اٹھانے کا کوئی موقع نہ مل سکا۔ جس سے ترقی و بہتری کی بہت سی توقعات وابستہ تھیں۔ بہتر صورت یہ ہوتی کہ ارباب جامعہ اور عہدہ داران تعلیمات کی ایک مشترکہ مجلس میں اس کو طے کیا جاتا اور دونوں اداروں کی عاملہ جماعتوں کی تائید حاصل کی جاتی۔

سر اکبر کو تعلیم نسواں سے بھی غیر معمولی دلچسپی تھی۔ اس تحریک کو فروغ دینے میں زیادہ تر ان کی شریک زندگی آمنہ حیدری کے مشوروں کو دخل رہا ہے۔ اس غرض سے نسوانی مدرسوں کی تعداد میں بہت کچھ اضافہ کیا گیا۔ اساتذہ کی تربیت کے لئے ٹریننگ اسکول بھی قائم کیا گیا۔ سر اکبر نے ایک دفعہ سچ کہا تھا کہ "میری رائے میں وقت کی اہم ضرورت ہے کہ لڑکیوں اور عورتوں کی تعلیم کا انتظام کیا جائے تاکہ وہ علم کی روشنی سے محروم نہ رہ سکیں۔

ہندوستان میں ناخواندگی کی ظلمتوں میں علم کی روشنی پھیلانے کے لئے نہ صرف نئی نسلوں کے لئے درسگاہوں کی ضرورت ہے بلکہ اس کے ساتھ ہی ایک بڑی تعداد میں اُن پڑھوں کی تعلیم کے لئے بھی مدارس قائم کرنا ناگزیر ہے سراکبر نے بالغوں کی تعلیم پر زور دیتے ہوئے درست کہا تھا کہ "اس وقت میرے نزدیک ابتدائی تعلیم سے بھی زیادہ اُن پڑھوں کی تعلیم پر توجہ کرنے کی ضرورت ہے"۔ اس کی وجہ محض یہ ہے کہ ملک میں بہت کچھ احساس پیدا ہوگیا ہے کہ بچوں کی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ ایسے ذرایع بھی حاصل ہوگئے ہیں جن سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ لیکن آئندہ نسلوں کی تعلیم کو مستقل کرنے کے لئے لازمی ہے کہ ان پڑھوں کو بھی تعلیم دی جائے تاکہ وہ اس کی اہمیت سے واقف ہوکر اپنی اولاد کی تعلیم پر توجہ کرسکیں۔

جہاں تک سراکبر کی تعلیم بالغان والی حکمت عمل کا تعلق ہے اس کی دو نوعیتیں تھیں۔ اول تو انھوں نے بلدیہ اور لوکلفنڈ کی مدوں سے مدارس شبینہ کا انتظام کرایا۔ دوسرے ان اداروں کی سرپرستی کی جو اس مہم کو سرانجام دینے کا بیڑہ اٹھاچکے تھے۔ ہندوستان میں تعلیم بالغان کو کامیاب بنانے کا مفید طریقہ صرف یہ ہے کہ ان اداروں کے کاموں میں مدد دی جائے جو کسی باقاعدہ نظام نامے کو پیش نظر رکھ کر اس مہم کو سر کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔ سراکبر کی یہ سرپرستی حیدرآباد میں بہت مفید اور بارآور ثابت ہوئی۔ سراکبر کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ کسی کام کو پورا کرنے کے آسان اور موثر طریقوں سے واقف تھے اسی لئے انھیں دوسروں کی نسبت ہر کام میں کامیابی ہوتی ہے۔

اس وقت حالات کا اقتضا یہ ہے کہ اعلیٰ تعلیم کو عام کرنے کے بجائے ملک سے ناخواندگی کو دور کرکے صنعت و حرفت اور اسی قسم کی فنی تعلیم کا انتظام کیا جائے تاکہ تعلیم یافتہ بے روزگاری کی مصیبتوں سے ملک کو نجات حاصل ہو۔ تعلیم کی اشاعت سے زیادہ اس کو ملک کے لئے مفید بنانا اہم ہے۔ حیدرآباد میں اس وقت صنعتی اور فنی مدارس قائم ہیں۔ ان کو کامیاب بنانے میں سراکبر کی شخصیت کو بہت کچھ دخل رہا ہے۔

۱۹۱۲ء میں جب کہ سراکبر معتمدی تعلیمات کی خدمت انجام دے رہے تھے۔ تعلیمات کا موازنہ تقریباً ۱۰ لاکھ تھا لیکن مرحوم کی کوششوں کے باعث ایک کروڑ ۳ لاکھ سے بھی زائد ہوگیا۔ ایک ایسی ریاست کا جس کی سالانہ آمدنی ۸ کروڑ ہو ایک کروڑ سے زیادہ رقم تعلیم عامہ پر صرف کرنا واقعی قابل ستائش ہے۔

نظامت صنعت و حرفت | مسٹر وکلیفیلڈ صدر ناظم صنعت و حرفت کی رخصت کے سلسلہ میں معتمدی عدالت

وامور عامہ کے علاوہ صنعت وحرفت کا شعبہ بھی ان کی نگرانی میں دیا گیا۔ اس شعبہ میں بھی قلیل مدت کے اندر بہت سی اصلاحیں کیں۔ جن میں سے بعض امور کا تذکرہ نہایت ضروری ہے۔

ا۔ روغن براری کے دستی آلات کی توسیع اور اس کی تعلیم سے دلچسپی۔

ب۔ سمنٹ کی صنعت کو فروغ دینے کے لئے ایک کارخانہ کے قیام سے متعلق ابتدائی امور طے کئے گئے۔

ج۔ کاغذ سازی کی قدیم صنعت کو جو کہ زوال پذیر ہوگئی تھی پھر سے زندہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ چنانچہ آج جب کہ جنگ کے زمانے میں کاغذ کی مانگ بڑھ گئی ہے۔ ہم ان کوششوں کو سرسبز ہوتا دیکھ رہے ہیں۔

د۔ یارچہ بافی کی تعلیم کا انتظام۔

س۔ طبقات الارض کی پیمائش اور اس کی ضرورت پر زور دیا گیا تاکہ ملک کے لئے مفید معدنیات حاصل کی جاسکیں۔

وزیر مالیات

۱۹۲۰ء میں جب کہ معتمدی امور عامہ کے فرائض انجام دے رہے تھے سر اکبر کی مدت ختم ہوئی اور وہ برطانوی ہند واپس ہوگئے جہاں بمبئی کی محاسبی درجہ اوّل کی خدمت پر مامور ہوگئے۔ مرحوم کی کارگزاریوں کا نہ صرف عوام بلکہ خود شاہ دکن نے جریدہ غیر معمولی کے ذریعے اعتراف کیا۔ سر اکبر کی واپسی کے بعد ان کی جگہ کو خالی محسوس کیا گیا اور معتمدی عدالت وامور عامہ پر حیدری مرحوم کو واپس بلاکر ان کا استقلال کیا گیا۔

تھوڑے عرصے تک معتمدی امور عامہ پر فائز رہنے کے بعد سر جی نالڈ گلانسی وزیر مالیات جب وظیفہ پر سبکدوش ہوئے تو سر اکبر کا ان کی جگہ تقرر ہوا۔ سر اکبر کو مالیات کے محکمہ سے بہت کافی واقفیت تھی جب یہ معتمد مالیات کی حیثیت سے عارضی طور کچھ عرصے کے لئے کارگزار تھے تو انھوں نے اس مختصر سی مدت میں بھی بہت سی اصلاحیں کی تھیں۔ اب کہ ان کا مستقل طور پر اس محکمہ کی سب سے بڑی اور ذمہ دار خدمت پر تقرر کیا گیا تھا انھیں اس محکمہ کی کارکردگی کو ترقی دینے اور ملک کے موازنہ کو بہتر بنانے کی طرف متوجہ ہونے کا بہت کافی موقع ملا۔ سر اکبر نے نہ صرف وزیر مالیات کی حیثیت سے اپنے انہماک اور دلچسپی کا ثبوت دیا بلکہ سنگارینی معدنیات اور شاہ آباد سمنٹ کے سرکاری ڈائرکٹر اور ریلوے بورڈ کے صدر بھی مقرر ہوئے۔

سیل بندی

سر اکبر نے وزارت مالیات کے عہدہ پر فائز ہونے کے بعد ضروری سمجھا کہ ملک کے مالیہ کی حالت کو بہتر بنانے کی طرف توجہ کی جائے۔ سررشتہ داری سیل بندی کے ذریعہ سر اکبر نے حیدرآباد کے مالیہ کی جو تنظیم کی ہے اس کو معاشی تاریخ میں زرّیں حرفوں میں لکھا جائے۔ مالیہ میں اس وقت دشواری پیدا ہونے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ سر جی نالڈ گلانسی نے ٹائیم اسکیل کو جاری کیا تھا جس کے باعث ایک کروڑ سے زائد مصارف میں اضافہ ہو گیا تھا۔ یہ صورت حال انتہا درجہ پریشان کن تھی۔ اس دشواریوں کو پیش نظر رکھ کر سر اکبر نے محکمہ بندی کے نام سے ایک تجویز پیش کی جس کو باب حکومت نے ان کی وزارت کے زمانے کا گراں قدر کارنامہ سمجھ کر قبول کیا۔ اور اس کے ساتھ سیل بندی کا جب اشتراک ہوتو محکمۂ مالیات کی تنظیم بہت ہی استوار بنیادوں پر مکمل ہو گئی محکمۂ بندی کے ذریعہ ہر سررشتہ کے لئے ایک خاص رقم مخصص کر دی جاتی ہے۔ اس محکمہ کے صدر کو معینہ رقم خرچ کرنے کا اختیار حاصل ہوتا ہے سیل بندی کے تحت ہر تیسرے سال سررشتہ کے اخراجات کی کفالت کے بعد جس قدر بچت ہوتی ہے اس کی نصف رقم آئندہ تعہد کے لئے سررشتہ ہی میں محفوظ کر لی جاتی ہے اور نصف رقم سرکاری خزانے میں جمع کرا دی جاتی ہے سر اکبر کی اس اصلاح کے باعث ایسے زمانے میں جبکہ کساد بازاری کے باعث دُنیا کی حکومتیں اپنے مالیہ کو استوار کرنے کے لئے پریشان ہیں۔ حیدرآباد کا مالیہ ان دشواریوں سے معمولی طور پر بھی متاثر نہیں ہوا۔ سر اکبر کے بعد سررشتہ داری بچتوں سے جنگی ضرورتوں اور زائد اخراجات کی کفالت تقریباً تین سال سے زیادہ عرصہ تک ہوتی رہی! اور کبھی بھی ٹیکس عائد کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ اس سال تنظیم کی بدولت حکومت اس قابل ہوئی کہ اپنے خزانے سے جملہ رقم ادا کر کے ریلوے خرید لے اور وقتاً فوقتاً حکومت برطانیہ کے پرامیسری نوٹ بھی خریدتی رہی۔ اس طرح دوسری حکومتوں اور عوام کی نظروں میں حکومت کے مالیہ کی ساکھ بڑھ گئی۔ ۱۹۲۲ء میں مالیات کے انتظامات میں بالکل تبدیلی ہو گئی تھی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دو سال کے اندر یعنی ۱۹۲۴ء تک جملہ ۲ کروڑ ۶ لاکھ کی کثیر بچت ہوئی جس کے باعث ریلوے کے لئے وافر رقم مدمحفوظ میں رکھ دی گئی اور جب ۱۹۲۷ء کے مالیہ پر غور کیا گیا تو یہ رقم ۳ کروڑ ۵ لاکھ تھی۔ اس سے تنظیم کی بتدریج ترقی اور افادیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے خسرو دکن نے فرمان کے ذریعہ ارشاد فرمایا تھا کہ

"ہمارا موازنہ جو اطمینان بخش ہے منظور کیا جاتا ہے اور جامعہ عثمانیہ کی عمارت کی تکمیل اور مندال سکریٹریٹ

اور پولس پیارکس کی تعمیر کی نسبت جو تجاویز پیش کی گئی تھیں وہ بھی منظور کئے جاتے ہیں۔ ان کاموں کو جلد اختتام کو پہنچایا جائے۔

۲۔ سر اکبر حیدری نے اپنے فینانس ممبری کے زمانے میں طریقہ سیل بندی کو رائج کرنے کے بعد جو موازنہ کا توازن قائم رکھ کر ہر صیغہ کی ترقی کے لئے معتدبہ رقم ہر سال شریک موازنہ کر کے ملک کی ترقی میں جو نمایاں حصہ لیا ہے اس سے بخوبی واقف ہوں اور ان کے تدبر اور دور اندیشی کی قدر کرتا ہوں۔ ان سے میری خوشنودی کا اظہار کیا جائے۔

سیاسی حکمت عملی

سر اکبر کی سیاسی حکمت عملی پر غور کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ حیدرآباد کے حالات کا مطالعہ کیا جائے۔ حیدرآباد سیاسی رجحانات اور اقتصادی حالات کے لحاظ سے ہندوستان کی نسبت بہت کچھ مختلف ہے۔ سب سے پہلے اور نمایاں فرق یہ ہے کہ حیدرآباد شاہان آصفیہ کے زیر اقتدار ان قدیم روایات کا حامل ہے جو ہندوستان میں برسوں پہلے مٹ چکی ہیں۔ مغلیہ شہنشاہیت کا چراغ جب گل ہو چکا تو ہندوؤں اور مسلمانوں میں اختلاف کی خلیج وسیع تر ہوتی گئی۔ اور فرقہ وارانہ مسائل کے باعث قومی حکومت کے قیام میں مزاحمتیں پیدا ہوتی رہیں۔ ان اثرات سے حیدرآباد بھی محفوظ نہ رہ سکا لیکن پھر بھی حیدرآباد کے مخصوص حالات ہیں۔ یہاں ہندو اور مسلمان دونوں شاہان آصفیہ سے فیض یاب ہو رہے ہیں اس لئے ان اثر انگیز قوتوں کو نشو و نما پانے کا موقع نہ ملا جو حیدرآباد کے باہر سے ملک کی حدوں میں داخل ہوئی تھیں۔ ان حالات کے اختلاف کی وجہ سے سیاسی معاملات میں ہندوستان کی نسبت مختلف طریقہ کار اختیار کرنا ضروری تھا لیکن سر اکبر اس حقیقت سے بھی پوری طرح واقف تھے کہ حیدرآباد کی قومی تعمیر میں ملک کے تمام طبقوں کو مساوی حقوق حاصل ہونے چاہئیں۔ ان قدیم روایات ہی کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ معاشرہ کے مختلف عناصر اور طبقوں میں نمایاں فرق موجود ہے۔ بعض طبقوں کو معاشی برتری اور تمدنی امتیاز حاصل ہے اس کے خلاف ملک کے ایسے طبقے بھی موجود ہیں جن کو یہ سہولتیں حاصل نہیں کہ وہ ترقی کی دوڑ میں دوسرے طبقوں کے ساتھ برابر کے شریک رہیں۔ اس لئے ضروری تھا کہ ملک کی ہر جہتی ترقی کے لئے ایک ایسا سیاسی دستور نافذ کیا جاتا جو ایک طرف تو ترقی پسندانہ رجحانات کا حامل ہو اور دوسری طرف بتدریج ملک کے طبقوں میں معاشی اور تمدنی امتیاز کو روایات کی بجائے مسابقت کی بنیادوں پر قائم کر سکے تاکہ تمام طبقے واحد اکائی کی حیثیت سے ترقی کے لئے جدوجہد کر سکیں

سر اکبر نے اپنے اقتدار کے ہر دور میں حیدرآباد کی تعمیر کے لئے ضروری سمجھا کہ اس کے باشندوں کو حتی الامکان ایک سطح پر لایا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو حیدرآباد کے جاگیردار طبقے کی حالت اور بھی زیادہ ناگفتہ بہ ہو جاتی اور اس سے جد وجہد اور مسابقت کا احساس ہی مٹ جاتا۔ ان ہی حالات کا اقتضاء تھا کہ سر اکبر نے دستوری اصلاحات کی طرف قدم بڑھایا۔ ان اصلاحات کے متعلق ایک سیاسی کارکن نے اپنی بہترین رائے کا اظہار کرتے ہوئے بالکل صحیح کہا تھا کہ "یہ قدیم روایات اور جدید سیاسی رجحانات کا بہترین امتزاج ہے یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ جس طرح جامعہ عثمانیہ کا تجربہ حیدرآباد کی سرزمین میں کامیاب ہوا اسی طرح مشرق اور مغرب کے سیاسی اداروں کا سنگم بھی یہی قطعہ ارض قرار پایا۔ ہماری سیاسی زندگی کا مقصد اصلی نوعیت حکومت نہیں بلکہ اچھی حکومت ہے۔ یہ مقصد خواہ مغربی سیاسی اداروں کو اختیار کرنے سے حاصل ہو یا خود مشرقی سیاسی نظام میں ترمیم کے ذریعہ پورا کیا جاسکے ہمیں ہر دو کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ اس سلسلے میں اس امر کو ملحوظ رکھنا بھی لازمی ہے کہ ہم دوسری قوموں اور ملکوں کے سیاسی تجربوں سے فائدہ اٹھا کر شاہان آصفیہ کے زیر سایہ ہر جہتی ترقیوں کے لئے کوشش کریں۔

سر اکبر کے سیاسی مسلک سے اختلاف رکھنے والے بھی موجود تھے۔ ان اختلاف کرنے والوں میں دو گروہ شامل تھے۔ اول تو وہ افراد تھے جو قدامت پرست ہیں اور ہر تبدیلی کو کفر قرار دیتے ہیں دوسرے وہ افراد ہیں جن کے تمدنی امتیاز اور معاشی آزادی کو دستوری اصلاحات کے باعث صدمہ پہنچتا تھا۔ یہ طبقہ زندگی کے ہر شعبہ میں تو تبدیلی کا خواہش مند ہے لیکن وہ قدیم سیاسی نظام کو اس لئے برقرار رکھنا چاہتا ہے کہ اس سے ذاتی مفادات وابستہ ہیں۔ ان دونوں طبقوں کے اختلاف میں کتنا وزن ہے اس کا بیان کرنا غیر ضروری ہے۔ جبکہ خود فرمانروائے متعدد مرتبہ اصلاحات کی ضرورت کو واضح فرمایا ہے۔

حیدرآباد بدلتی ہوئی دنیا کے اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ دنیا کے ہر حصے میں انقلاب کے سیلاب اُمڈ رہے ہیں۔ ان سے چشم پوشی کرنا اپنے فرض سے غفلت کرنے کے مترادف ہے۔ آنے والے سیلاب کی راہ میں سیاہ پتھر کی چٹان کا بند باندھ کر اطمینان کا سانس لینا صحیح تدبر نہیں ہے۔ سر اکبر اس راز سے پوری طرح واقف تھے کہ انقلاب کی جو متلاطم موجیں اٹھ رہی ہیں۔ اس کو اپنے لئے مفید بنانے کا بہترین طریقہ یہ ہوگا کہ اس کے لئے

ایسی راہیں قبل از قبل بنالی جائیں جس سے گزر کر تباہی و بربادی کے بجائے یہ قومی زندگی کے مرغزاروں کو سیراب کرنے کا ذریعہ ثابت ہوں وہ اس سے بخوبی واقف تھے کہ کسی نقصان کے بغیر ہر آنے والے انقلاب سے ملک کو فائدہ پہنچانے کے لئے بہترین تدبیر یہی ہے کہ حالات سازگار بنائے جائیں۔ ہم سے زیادہ مستقبل کا مورخ اسکی اہمیت کو واضح طور پر بیان کرسکے گا۔

سراکبر نے جن دستوری اصلاحات کے ذریعہ پیشہ ورانہ بنیادوں پر انتخابات کو رائج کیا ہے وہ ہندوستان کے سیاسی مرض کا بھی واحد اور موثر علاج ہے۔ ہندوستان کے آئندہ دستور میں سراکبر کے بنائے ہوئے قانون سے ضرور بصیرت حاصل کی جائے گی۔

خانگی زندگی

سراکبر کو فطرت کی طرف سے ایسی خصوصیتیں حاصل ہوئی تھیں جن کی بدولت وہ ترقی کی ہر منزل میں کامیاب رہے۔ سراکبر میں حیثیت انسان بہت سے محاسن تھے۔ ان کی مذہبی رواداری اور وسعت نظری دوسروں کے لئے قابل تقلید تھی۔ ان کی سب سے بڑی خوبی محنت اور جستجو پسندی ہے۔ انھوں زندگی کے سفر میں ہر نشیب و فراز کو دیکھا ان کی وفات پر خسرو دکن نے بجا ارشاد فرمایا تھا کہ سراکبر کو اپنی زندگی میں ہر قسم کی عزت، مرتبہ اور شہرت حاصل ہوئی۔ اور اس طرح ان کی بہترین تمناؤں پوری ہوئیں ان گراں قدر الفاظ سے سراکبر کی زندگی کے حالات اور فکر و عمل کے توانائیوں کی صحیح ترجمانی ہوتی ہے۔ سراکبر کے ذمہ ریاست کے مختلف امور تھے۔ اور انھوں نے سب کو پوری دلچسپی اور انہماک سے انجام دیا وہ روزانہ ۱۶ گھنٹوں سے بھی زیادہ کام کرنے کے عادی تھے۔ زندگی کی ان گوناگوں مصروفتوں ہی کو دیکھ کر کسی انگریز اخبار نویس خاتون نے سراکبر کے متعلق بالکل درست کہا تھا۔ "سراکبر ایک زبردست دماغی مشین کے مالک ہیں جن کے کام کی نوعیت ایک انسانی دماغ سے بالاتر ضرور معلوم ہوتی ہے۔"

سراکبر کے معروف نظام نامہ میں سیاست خارجی، انتظام مالیات اور نظم و نسق کے علاوہ ایسے اداروں کے کاروبار سے متعلق مشورے بھی شامل تھے جن کے وہ سرپرست تھے۔

سراکبر کی خانگی زندگی کو خوشگوار اور قومی و اجتماعی زندگی کو بے مثال بنانے میں ان کی شریک زندگی آمنہ حیدری کو خاص دخل تھا۔ سراکبر کی زندگی کے حالات لیڈی حیدری کے تذکرہ کے بغیر پورے نہیں ہوسکتے آمنہ حیدری

نے نہ صرف سر اکبر کی خانگی زندگی کے خوشگوار اور نشاط آگیں بنانے میں اپنا خون پسینہ ایک کیا بلکہ خود بھی اجتماعی مفاد کی سرگرمیوں میں حصہ لیتی رہیں وہ حیدرآباد کی خواتین میں زیادہ مقبول تھیں۔ ہر نسوانی تحریک کی وہ رہنمائی کرتی رہیں ان دونوں کو ایک دوسرے سے جو والہانہ انس و محبت تھی وہ ملک کے طول و عرض میں مشہور ہے اور اسے مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ خسرو دکن نے بالکل بجا ارشاد فرمایا تھا۔ ملک میں دو جوڑے ہی مشہور تھے۔ ایک تو فخر الملک بہادر اور دوسرے سر اکبر حیدری کا ان دونوں کی بصیرت افروز زندگی سے متاثر ہو کر ترکی کی مشہور و معروف بین اقوامی شہرت کی مالک خاتون خالدہ ادیب خانم نے اپنی کتاب "اندرون ہند" میں جن اچھے الفاظ میں ان دونوں کی شخصیتوں کو سراہا ہے اس سے ان کے خانگی زندگی کی سچی تصویر کھچ جاتی ہے۔ سر اکبر کے متعلق خاص طور پر بیان کیا جاتا ہے کہ ان کی مہمان نوازی کا دائرہ بہت وسیع تھا یہ ناممکن تھا کہ کوئی شخص باہر سے آتا اور اس کی سر اکبر اور لیڈی حیدری کے شخصی مہمان کی حیثیت سے ان کی میزبانی سے مسرت حاصل کرنے کا موقع نہ ملتا ہو۔ سر اکبر کو ہندوستان اور اس کے باہر جو اثر و شہرت حاصل تھی وہ بہت کچھ ان کے وسیع تعلقات کی وجہ سے تھی سر اکبر کو اپنی زندگی میں اپنی شریک حیات کی جدائی کا داغ لینا پڑا۔ اس صدمہ کا اندازہ اس امر سے ہوتا ہے کہ سر اکبر آخری زمانہ تک اسی راستہ سے گزرتے رہے جس راستے سے کہ آمنہ حیدری کا جنازہ گزرا تھا۔ یہ امر بھی قابل تذکرہ ہے کہ خیرت آباد کی مسجد قطب شاہی میں جس طرح آمنہ حیدری کے جنازہ کی نماز ادا ہوئی تھی سر اکبر حیدری کے جنازہ کی نماز بھی اسی مسجد میں پڑھی گئی اور آخر کار آمنہ حیدری کے پہلو میں دفن کئے گئے آنے والی نسلوں کو یہ ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو مدفون ہو کر قلبی محبت کا اثر افریں درس دیتے رہیں گے۔

سر اکبر مرحوم صوم و صلوٰۃ کے بے انتہا پابند تھے وہ ایسے اکثر موقعوں پر بھی جبکہ وہ سیاسی مسائل پر دنیا کے اعلیٰ ترین مدبروں کی مجلس میں بیٹھ کر ہندوستان کے مستقبل کے دستور کے متعلق بحث و مباحثہ میں مصروف ہوتے اگر نماز کا وقت ہو جاتا تو اس فرض کو ادا کرنے سے کبھی نہیں چوکتے تھے اور آخری زمانے میں مذہبی عقیدت زیادہ غالب آگئی تھی۔ ان کے نزدیک مسجد و حرم اور بتخانہ و دیر میں ایک ہی جلوہ قابل پرستش تھا یہی وجہ تھی کہ وہ صلح کل کے حامل تھے سر اکبر کو بزرگوں سے خاص انس و دلچسپی تھی ان کا دروازہ فقراء کے لئے کھلا ہوا تھا۔ ان کے فیضان کرم سے بلا امتیاز کوئی حاجتمند ہو یا نہیں سبھی مستفید ہوتے تھے۔

سرا کبر کی غریب نوازی ضرب المثل ہے اگر ان کے دفتر کا کوئی چپراسی بھی کسی تقریب میں انھیں دعوت دیتا تو وہ اسے قبول کرنے سے کبھی انکار نہیں کرتے نہ صرف دعوت قبول کرتے بلکہ اس تقریب میں شریک ہوکر اپنی غریب نوازی کا بھی ثبوت دیتے۔ ان کا برتاؤ سب کے ساتھ یکساں تھا۔

سرا کبر کے ماتحتوں میں کوئی بیمار ہو جاتا اور سرا کبر کو اسکی اطلاع ہوتی تو یہ ناممکن تھا کہ کسی نہ کسی طریقہ سے اس کی مزاج پرسی نہ کر لیتے۔ ان کی گوناگوں مصروفیتوں کے باوجود ان فرائض کا بھول جانا ان کے لئے ناممکن تھا۔

سرا کبر فیض انسان تھے ان کو جب کسی کے متعلق یہ معلوم ہو جاتا کہ اس میں ترقی کے جوہر ہیں اور اسکے ساتھ وہ قابل اعتماد بھی ہے تو اسکے لئے جس قدر ترقی کے امکانات ہوتے انھیں پورا کرنے میں کبھی دریغ نہیں کرتے تھے وہ ہر انسان کو آزمانے اور اس کی محنت و جفاکشی معلوم کرنے کے مواقع پیدا کرتے تھے ان کی مردم شناسی کا خاصہ یہی تھا یہی وجہ تھی کہ ان کے اطراف انکے ہی خواہوں اور قابل اعتماد دوستوں کا ایک بڑا گروہ تھا جو نہ صرف سرا کبر کے ذاتی اور شخصی مفاد کو ملحوظ رکھتا تھا بلکہ سرا کبر نے انکی فلاح اور قوم کی ترقی کے لئے جو خاکے تیار کئے تھے ان میں رنگ آمیزی بھی اسی گروہ کے افراد کا فرض تھا۔

سرا کبر کی زندگی میں انھیں خسرو دکن اور برطانوی حکومت کی جانب سے بہت سے اعزازات حاصل ہوئے سب سے پہلے سالگرہ کی تقریب میں نواب حیدر نواز جنگ بہادر کا خطاب عطا کیا گیا اس کے بعد ہی برطانیہ عظمیٰ کی جانب سے نائٹ ہڈ اور پریوی کونسل کے اعزاز عطا کئے گئے۔ سرا کبر کی غیر معمولی صلاحیتوں اور بہترین سیاسی کارناموں کے اعتراف میں کئی جامعات نے بھی اعزازی طیلسان دئے جامعہ مدراس اور جامعہ عثمانیہ کی جانب سے ال ال ڈی کی ڈگریاں ملیں اس کے بعد دنیا کی عظیم ترین جامعہ آکسفورڈ سے ڈی سی ال کا قانون اعزاز بخشا گیا جس سے انکی بین اقوامی شہرت کی تصدیق ہوتی ہے جب یہ فرانس سے واپس ہو رہے تھے تو پیرس کی نمائش میں ایک نوآبادیاتی نمائندے نے سرا کبر کی ممتاز شخصیت کے سینے پر "نوآبادیاتی ریفارمر" کا اعلیٰ ترین اعزاز لگایا۔

سرا کبر دنیا کے اعلیٰ ترین مدبروں میں شامل تھے انکی زندگی کے واقعات نوجوان نسلوں کے لئے شمع ہدایت کا کام دیں گے خاص طور پر جامعہ عثمانیہ سے سرا کبر کو جو خلوص و محبت تھی اس کا اقتضاء یہ ہے کہ عثمانین مرحوم کی ان بہترین تمناؤں کو پورا کریں جن کا ہم نے ابتدائی سطروں میں تذکرہ کیا ہے۔ عثمانین کا فرض ہے کہ وہ سرا کبر کے بنائے ہوئے خاکوں میں رنگ بھر کر کے ان اعلیٰ ترین مقاصد کو حاصل کریں جسکی طرف مرحوم نے رہنمائی کی ہے۔

رحیم الدین کمال ظہیر آبادی

سر اکبر — ماہر مالیات

(اس مضمون پر انعامی مقابلۂ حیدری نمبر برائے (بی اے) کے لئے انعام اول دیا گیا (ادارہ)

کسی ملک کی معاشی خوشحالی کا اندازہ اس کے مالیہ سے کیا جاتا ہے۔ مملکت کی مالی حالت اُس کو تحکم یا تنزلی کی راہ پر ڈالتی ہے اس لئے مملکت کی مشنری میں مالیہ امتیازی مقام رکھتا ہے گھڑی میں بال کمان کی جو اہمیت ہے وہی مالیہ کی کسی سلطنت میں ہوتی ہے۔ مملکت کی ترقی کا دارومدار اس کے بہتر مالیہ پر ہے۔ بہتر مالیہ کا معیار صرف یہ نہیں ہے کہ مملکت کی آمدنی خرچ کے لئے کفایت کرے بلکہ اس کا معیار یہ ہے کہ باشندے انفرادی طور پر زیادہ سے زیادہ محاصل ادا کریں جو بعد میں ان کی اجتماعی حیثیت پر حکومت کی جانب سے وافر مقدار میں صرف کئے جاسکیں۔ ممالک کی خوشحالی کا معیار یہی ہے کہ اُس کے باشندے زیادہ سے زیادہ محاصل ادا کریں۔ کسی حکومت کے باشندے اسی وقت زیادہ محاصل ادا کرسکتے ہیں جب کہ ان میں اتنی استطاعت ہو کہ وہ اپنی ضروریات کو پوری کرنے کے بعد حکومت کو کافی رقم دے سکیں۔ اپنی ضروریات کو ملتوی رکھ کر ٹکس ادا کرنا افلاس سمجھا جاتا ہے۔ یہ استطاعت اُسی وقت پیدا ہوسکتی ہے جب کہ مملکت کے باشندوں کے ذرائع آمدنی وسیع ہوں اُن کی آمدنیاں کافی ہوں، یہ صرف اُسی حالت میں ممکن ہے جب کہ ملک میں پیدائش دولت کے کافی وسائل ہوں اور باشندے اُن سے پورا پورا استفادہ کرنے کے حق کے ساتھ ساتھ اُس کی اہلیت بھی رکھتے ہوں۔ اس طرح سے ملک کے مالیہ کے تحکم ہونے کا دارومدار ملک کی معاشی خوشحالی پر ہے۔ حکومت کا شعبہ مالیہ ہی دراصل وہ اہم اور مضبوط کڑی ہے جو معاشیات اور سیاسیات کو ملاتی ہے۔ جب تک یہ کڑی مضبوط ہے ملک کی سیاسی حالت بھی مستحکم ہوگی اور جب یہ کڑی ناقص ہوجائے تو سیاسی انحطاط شروع ہوجاتا ہے جو معاشی انحطاط کا نتیجہ ہوتا ہے جب ہم اس معیار سے مملکت آصفیہ کے مالیہ کو جانچنے کی کوشش کریں گے تو ہمیں نا امیدی ہوگی۔ حکومت

کے زیر سایہ بسنے والوں میں اس قدر انتظاعت پیدا نہ ہوسکی کہ وہ زیادہ سے زیادہ محاصل عام طور پر ادا کریں حکومت کے ذرائع آمدنی میں اس وقت ہم کو بعض ایسے مدات نظر نہیں آتے جو آسانی سے حکومت کی آمدنی میں اضافہ کا باعث ہوسکتے ہیں۔ محصول کا اہم اصول یہ ہے کہ وہ اس طرح وصول و عائد کیا جائے کہ ادا کنندوں پر بار نہ ہو۔ اور وہ اس کو محسوس نہ کریں۔ مملکت آصفیہ میں انکم ٹکس کا عدم وجود اس کی بہترین مثال ہے۔ مملکت کے مالیہ کے انحکام کا یہ شعبہ اس وقت معطل ہے یا یوں کہا جاسکتا ہے کہ وہ آمدنی جو حکومت آسانی سے حاصل کرسکتی ہے، اُس سے درگذر کر رہی ہے یہ کہنا بالکل نادرست ہے کہ مملکت آصفیہ کے مالیہ کا بار تمام و کمال غریب اور خصوصاً کسان طبقہ پر ہے۔ لیکن یہ درست ہے کہ انحکام میں سرمایہ دار شایانِ شان حصہ نہیں لے رہے ہیں۔ اس کمی کو سر اکبر نے محسوس کیا۔ اور انکم ٹکس کے متعلق ایک سے زائد دفعہ پبلک تقاریر میں فرمایا تھا کہ حکومت اس جانب متوجہ ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی حکومت اس اہم مسئلہ کے جملہ پہلوؤں پر غور کرنے میں مصروف ہے اور اُس کی روایتی دور اندیشی اسے کسی قطعی تصفیہ پر نہیں پہنچا سکی۔

ملک کے باشندوں کی آمدنی کے معیار سے اس وقت ہم کو تشفی نہیں ہوسکتی۔ اُن ساری تدابیر و ترقیات کے باوجود جو سر اکبر کا زرّیں کارنامہ کہے جاسکتے ہیں ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ ملک کے اکثر وسائل پیدائش دولت اس وقت تک اچھوت ہیں اور بعض بالکل غیر ترقی یافتہ حالت میں ہیں بعض بیش بہا غیروں کے قبضہ میں دے دیئے گئے ہیں جن پر ملک کا کوئی حق نہیں ہے صرف حکومت کو اس پر حق مالکانہ حاصل ہے۔ اس کی مثال معدن طلا اور کوئلہ ہیں۔

صنعت و حرفت میں مملکت کو کوئی امتیازی مقام اس وقت تک حاصل نہ ہوسکا اس کے ذمہ دار ہم صرف حکومت کے مالیہ کو ہی نہیں بلکہ اور دیگر اسباب کو بھی ٹھیرا سکتے ہیں لیکن یہ بدیہی ہے کہ صنعت و حرفت کی حکومت کی جانب سے موثر ہمت افزائی اور امداد نہ ہوسکی لیکن غور طلب یہ امر ہے کہ ملک کے مالیہ نے جو امداد کی تھی وہ مناسب اور طریقہ امداد مفید تھا یا نہیں؟ اس کا مختصراً یہ جواب ہوسکتا ہے کہ مالیہ نے صنعتوں کی ممکنہ امداد نہ کی اور طریقہ امداد بھی زیادہ موثر نہ تھا۔

سر اکبر نے جو جد و جہد ریلوے کی خریدی کے سلسلہ میں کی اکثر لوگوں کو اُن سے بدظن کرادیا۔ اور بڑی

حد تک مرحوم کی مقبولیت عامہ اسی سے متاثر ہوئی۔ ہمیں اس سے بحث نہیں کہ سراکبر اس میں کس حد تک حق بجانب تھے دیکھنا صرف یہ ہے کہ اُس کے اثرات ملک کے لئے مُضر تو نہیں ہوئے؟ یہ درست ہے کہ اس خریدی سے مالیہ پر قرض کا بار پڑا لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس خریدی کی بدولت حکومت سے زیادہ مُلک اور اُس کے باشندوں کو نفع ہوا۔ ملک کے وسائل حمل و نقل اور رسل و رسائل کی ترقی کی جد و جہد کی عمر اس قبل از وقت خریدی سے بڑھ گئی۔ چونکہ اس خریدی میں سراکبر نے نمایاں حصہ لیا تھا اس لئے اس کو خاطر خواہ نفع بخش ثابت کرنے کی ذمہ داری قدرتاً سراکبر پر تھی۔ انھوں نے جب دیکھا کہ محض ریلوے نفع بخش نہیں ہیں تو اس کی تلافی کے لیئے بیوں کا انتظام کیا جو بڑی حد تک ریلوے کے خسارے کی تلافی کے علاوہ ریلوے کی آمدنی میں معقول اضافہ کا باعث ہوئیں اور ریل اور سڑک کے متنازعہ فیہ مسئلہ کے حل اور اس کی ہم آہنگی کی مثال قائم کرکے سارے ہندوستان کی رہبری کی بہت مکرر یہ تھا کہ جب معاہدے کی مدت ختم ہو جاتی اور ریل اس کے بموجب حکومت کی ملک ہو جاتی تو اس کو نفع بخش بنانے اور اس سے ملک کی ترقی میں مدد لینے کا یہ موقع پیدا نہ ہوتا جو قبل از وقت خریدی کی صورت میں ہوا۔ ختم معیاد پر ریلیں حکومت کی مِلک ہو جاتیں تو اس نفع بخش طور پر چلانے کی ذمہ داری کسی پر عائد نہ ہوتی جو اس صورت میں سراکبر پر تھی اور جس کو انھوں نے انتہائی قابلیت سے پورا کیا۔

ان مختصر اعتراضات یا اُن کے جوابات کے بعد سراکبر کے دورِ وزارتِ مالیہ پر کئے جاتے ہیں، اب ہم سراکبر کو ایک ماہر مالیات کی حیثیت میں دیکھنے کی کوشش کریں گے۔ سراکبر کے دورِ وزارتِ مالیہ کے سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اُن سے قبل ملک کی مالیہ کی حالت کا جائزہ لیں بغیر تاریخی پس منظر کے سراکبر کی اصلاحات کی اہمیت پوری طرح واضح نہ ہو سکیگی۔ اس تاریخی پس منظر کے پیش کرنے میں تفصیل کی قطعی گنجائش نہیں ہے، اس لئے صرف چند عریاں حقائق کو بیان کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

مملکت آصفیہ کے مالیہ کا تاریخی پس منظر

مورخ بستان آصفیہ مانک راؤ وٹھل راؤ کا بیان ہے کہ:۔ نواب ناصر الدولہ بہادر کے عہد تک انتظام سلطنت اور وصول تحصیل زیادہ تر تنخہ داری طریقہ پر ہوتی تھی۔ اس وجہ سے خزانہ خالی تھا۔ سرکاری نوکروں کی تنخواہ ماہ بماہ نہ ملتی تھی اس کے علاوہ تمام اضلاع اور تعلقات عربوں اور مہاجنوں کے پاس رہن تھے۔ جب نواب

۱۔ سہولت کی خاطر معنوں کے آخر میں جیسے درست کئے ہیں (۱) شاہان آصفی (۲) وزرائے آصفی (۳) وزرائے مالیہ آصفی

سالار جنگ مختار الملک ہوئے تو اس طریقہ کو مسدود کر کے شخصی مالگزاری کا طریقہ رائج کیا۔ ۱۲۸۰ھ ہجری میں مجلس مالگزاری قائم ہوئی اور ۱۲۸۳ھ ہجری میں جدید صوبے، ضلعے اور تعلقے قائم ہوئے اس کی تجدید پھر ۱۳۲۲ھ ہجری میں ہوئی ملک کی آمدنی غفراں مکاں اعلیحضرت نواب میر محبوب علی خاں کی تخت نشینی کے وقت صرف چار کروڑ روپیہ تھی۔ اس سے قبل ملک کی حالت کا اندازہ اس اقتباس سے ہوگا:۔ ..... ملک کی مالی حیثیت اس حالت کو پہنچ گئی تھی کہ خزانہ کا نام نہ تھا قرضہ پر سارے مصارف کا دارومدار تھا۔ اور اس کے بہم پہنچنے میں سخت دقتیں اٹھانی پڑتی تھیں۔ اس پر بھی جب تک خاطر خواہ سود ادا نہ کیا جائے اور ساتھ ہی کوئی جائداد یا کوئی حصہ ملک مکفول نہ کیا جائے قرضہ نہیں ملتا تھا۔ سلطنت کے احکام اور وعدوں کی کوئی وقعت نہ تھی۔"

اس حالت سے مملکت آصفیہ کو نکال کر شاہراہ ترقی پر ڈالنے کا سہرا حقیقت میں سر سالار جنگ اول کے سر ہے لیکن ہم کو اس وقت سر اکبر سے بحث ہے۔ اس لئے اُن اصلاحات کا ذکر نہیں کیا جا سکتا جو سر سالار جنگ کی فکر و جد و جہد کا نتیجہ تھیں لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سر اکبر کی کھڑی کی ہوئی عمارت کا پایہ دراصل سر سالار جنگ کا رکھا ہوا تھا اس گئی گزری حالت میں بھی شاہان آصفی نے اس کو درست کرنے کی جد و جہد سے اغماض نہ کیا۔ جب بھی سیاسی بکھیڑوں سے فرصت ملتی ملک کی معاشی خوشحالی کی طرف رجوع ہوتے رہے۔ نواب افضل الدولہ آصف جاہ خامس نے عدالت، تعمیرات طبابت، تعلیمات، پولس، صفائی وغیرہ کے محکمے قائم فرمائے جس کی تنظیم سالار جنگ نے کی۔ ان میں جنگلات کا ۱۲۷۶ف میں ٹپہ کا ۱۲۷۹ف میں اور آبپاشی کا ۱۲۸۶ف میں اضافہ ہوا۔

مملکت آصفیہ کے مالیہ پر سیاسی حالات اور جنگوں نے بہت بار ڈالا تھا۔ غیر متعلقہ جنگوں میں لاپچ دیکر اور جبر کر کے شریک کیا جاتا اور آخر میں صرف نقصان کی تلافی حکومت کے ذمہ کیجاتی۔ ان حالات کا نتیجہ یہ ہوا کہ منیر الملک اور چندو لال کے دور وزارت میں ریاست کے مداخل و مخارج کا توازن باقی نہ رہا۔ قرض لیکر خسارہ پورا کرنا ریاست کی مالی پالیسی کا ایک مستقل جزو بن گیا۔ حیدرآباد میں پامر کمپنی ساہوکارہ کا کام کرتی تھی جس سے حکومت سرکار عالی (۲۴) فی صد شرح سود پر رقومات لیتی تھی۔ اس کمپنی سے لیڈیز نٹ اور گورنر جنرل کا تعلق ثابت ہوا۔ ۱۸۲۴ء تک ریاست اس کمپنی کی (۱۶) لاکھ کی مقروض تھی۔ جس کے عوض کمپنی کو شمالی سرکار کی (۷) لاکھ سالانہ رقم معاف کر دی گئی تھی۔ اس کے بعد مہاجنوں سے قرض لیا جاتا رہا۔ قرض کی ادائی میں نواب سکندر جاہ نے ایک کروڑ اور نواب ناصر الدولہ نے

(۸۰) لاکھ دئے لیکن پھر بھی اس قدر وافر مقدار میں قرض لیا جاتا رہا کہ چندو لال کی علحدگی کے وقت ۱۸۴۳ء میں (۲) کروڑ قرضہ تھا۔

۱۸۴۲ء میں مملکت کے آمد و خرچ کے توازن کا اندازہ اس گوشوارہ سے ہو سکتا ہے جو اس وقت کا مرتبہ ہے جب کہ نواب ناصر الدولہ نے ریاست کا انتظام براہ راست اپنے ہاتھ میں لیا تھا۔

آمدنی بوضع اخراجاتِ نظم و نسق	۱۲۲۴۹۵۴۵
خرچ خاندان شاہی و ملازمین بارگاہ	۲۸۰۱۰۲۷
،، کنٹنجنٹ و چوتھ وغیرہ	۴۰۲۴۱۱۴
،، شاہی فوج	۶۴۱۳۹۵۲
منصب دار وغیرہ	۱۷۸۰۱۲۶
جملہ خرچ	۱۵۰۹۱۱۹
خسارہ	۲۷۳۹۵۷۴

اس کے بعد ملک میں عام بیداری کی لہر اٹھی ملک اور مالک کے خدمت گار پیدا ہونے لگے اور اُن کو خوش قسمتی سے خدمت کے مواقع بھی ملتے رہے۔ سالار جنگ اولیٰ، سالار جنگ ثانی، سر آسمان جاہ، نواب وقار الامراء، مہاراجہ کشن پرشاد وغیرہ کے علاوہ ملک کے مالیہ کی اصلاح کے لئے انگریز ماہرین کی خدمات حاصل کی گئیں۔ اس مسلسل جد و جہد نے ملک کے مالیہ کو سنبھالا اور اس قابل بنایا کہ وہ ۱۹۱۴ء میں اپنے حلیف برطانیہ کی اس مندرجہ ذیل گراں قدر رقموں سے مدد کر سکا۔

قرضہ جنگ ایک کروڑ چھبیس لاکھ، انصرام جنگ کے لئے بطور امداد ایک کروڑ بیاسی لاکھ نونہزار چھ سو، بیسویں کنہاؤں اور امپیریل ٹروپس کے لئے ایک کروڑ (۲۴) لاکھ خاص عطیہ پندرہ لاکھ

سخت البحر آبدوز کشتیوں سے مدافعت کے لئے پندرہ لاکھ، شہنشاہ کی شادی کی سلور جوبلی کے موقع پر پونے چار لاکھ پرنس آف ویلز ریلیف فنڈ میں دس لاکھ، امپیریل ریلیف فنڈ میں دس لاکھ متفرق (۱۳۴۶۰۰)

مالیہ کو سر اکبر نے اس قدر مستحکم کیا کہ حکومت سرکار عالی نے موجودہ جنگ کے ابتدائی صرف نو مہینوں میں حسب ذیل رقمی اعانت کی:- چندے و عطائے، ایک کروڑ سے زائد حیدرآباد اسکواڈرن کے قیام کے لئے ایک لاکھ پونڈ، اس کی حفاظت کے لئے پچاس ہزار پونڈ، دوسرا عطیہ پچاس ہزار پونڈ، تیسرا عطیہ پانچ لاکھ روپیہ قرضہ بلکل تمسکات بلاسود کی پچاس لاکھ دوران جنگ کے لئے موجودہ ماہوار امداد ڈیڑھ لاکھ، ہز بکنگ فنڈ بیس لاکھ۔

سر اکبر نے عہدۂ صدر المہامی نظامت سرکار عالی کا جائزہ ۳۰ امرداد ۱۳۳۰ف کو حاصل کیا۔ ۲۸ اردی بہشت ۱۳۴۶ف کو اس عہدہ سے ترقی پاکر صدارت عظمیٰ کا جائزہ حاصل فرمایا۔ اس طرح آپ سے قبل مالیہ کی حالت اندازہ کرنے کے لئے ۱۳۲۶ف تا ۱۳۲۹ف کے اعداد پیش کئے جاتے ہیں۔

مدات	حقیقی رقم ۱۳۲۷ف	اندازہ ۱۳۲۶ف	اندازہ ۱۳۲۹ف
آمدنی	۶۱۱۳۴۲۶۰	۵۴۷۴۷۰۰۰	۵۸۵۶۳۰۰۰
خرچ	۶۰۸۰۴۴۳۷	۶۰۱۰۶۰۰۰	۶۲۶۳۸۰۰۰
خسارہ	—	۵۳۵۹۰۰۰	۴۰۷۵۰۰۰

سنین ۱۳۲۷ تا ۱۳۲۹ف کے بعض اہم مدات خرچ کو ذیل میں درج کیا جاتا ہے جس سے مقصود یہ ہے کہ سر اکبر کے دور وزارت مالیہ میں ان ہی مدات کے خرچ میں جو اضافہ ہوا اُس کا اندازہ ہوسکے یہ مدات ایسے ہیں جن کو ہم قومی تعمیر کے مصارف سے تعبیر کرسکتے ہیں۔ ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم آسانی سے اندازہ کرسکیں گے کہ ملک کا مالیہ سر اکبر سے قبل قومی تعمیر کے کاموں پر کس قدر روپیہ صرف کرتا تھا اور پھر سر اکبر کے دور میں نیز

ان کے بعد اسی کام پر کس قدر روپیہ خرچ کیا جانے لگا۔

مدات	حقیقی خرچ ۱۳۲۷ف	اندازہ ۱۳۲۸ف	اندازہ ۱۳۲۹ف
پیمائش بندوبست اراضی	۲۸۲۷۲۰	۵۱۲۳۰۴	۴۸۱۷۱۰
انجمن ہائے امداد باہمی	۱۳۲۹ف سے قبل کے پانچ سالوں کا اوسط سالانہ خرچ صرف ۲۰۳۰۰۰ تھا		
زراعت	〃 〃	〃	۴۱۹۹۸ تھا
عدالت	۱۰۹۵۳۰۹	۱۲۰۰۰۰۰	۱۲۰۰۰۰۰
تعلیمات	۲۱۸۶۱۰۵	۲۷۶۲۰۰۰	۳۴۰۰۰۰۰
طبابت	۱۳۳۸۱۹۹	۱۴۱۳۰۰۰	۱۵۰۰۰۰۰
تعمیرات عامہ	۱۰۷۶۹۲۳۶	۱۰۲۰۰۰۰۰	۱۱۵۰۰۰۰۰
انسداد قحط کا مدِ محفوظ	۱۳۲۹ف سے پانچ سال کا اوسط خرچ ۳۳۷۴ تھا لیکن ۱۳۲۹ف میں		۴۰۰۰۰۰۰
مداوائی قرضہ	۲۷۲۹۲۳۲	۲۷۷۸۰۰۰	۲۸۲۵۰۰۰

مالیہ کی غیر متوازن حالت کو پورا کرنے کے لئے قرضہ کی ضرورت تھی۔ اس سے قبل بھی مختلف اوقات میں مختلف اغراض کے لئے قرض لئے گئے تھے جن کا کچھ حصہ ادا کیا گیا تھا، اور کچھ باقی تھا۔ اس کو ذیل کے جدول سے واضح کرنے کی کوشش کی جاتی ہے:۔

نام قرضہ	اصل رقم جو حاصل کی گئی تھی	۱۳۲۹ف تک ادائی کے بعد بقایا
۱) قرضہ دو کروڑ ۴ فیصد والا۔	۲۰۰۰۰۰۰۰ سکہ کلدار	۱۳۳۸۰۶۹ سکہ کلدار

۲) مطالبات صرفخاص مبارک	۱۰۸۵۶۹۲۶ سکہ عثمانیہ	۲۲۵۶۹۲۶ سکہ عثمانیہ
۳) پرامیسری نوٹ سرکار عالی ۶ فیصد سود:-		
الف قرضہ مجاریہ ۱۳۰۶ف	۲۶۹۶۴۰۰	۱۵۳۰۶۰۰
ب قرضہ مجاریہ ۱۳۲۶ف:-		
۱) اداشدنی ۱۳۳۰ف	۱۲۹۰۶۵۰	۱۲۹۰۶۵۰
۲) اداشدنی ۱۳۳۹ف	۷۰۴۰۴۰۰	۷۰۴۰۴۰۰
۴) حصص ریلوئے قدیم	۵۲۲۷۶۶۵	۳۴۵۶۸۴۴

اس طرح سے سراکبر پر یہ بڑی بھاری ذمہ داری عائد ہوتی تھی کہ وہ ایک طرف تو مالیہ کی اس غیر متوازن حالت کو درست کریں اور اس کو اس سطح پر لائیں جہاں پر حقیقی آمدنی حقیقی صرف سے زیادہ ہو، آمد و خرچ زمانہ کے متبدل حالات کے ساز گار ہوں اور دوسری طرف یہ خیال بھی رکھنا تھا کہ ملک کے باشندے ٹیکس ادا کرنے کی زیادہ قوت سے محروم ہیں اور پھر قومی تعمیر نیز معاشی ترقیات کے لئے کثیر مصارف لازمی ہیں۔ ان حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے سراکبر نے جو تجویز پیش کی اس کو خود مرحوم نے "اسکیم سرشتہ واری سیل بندی مالیہ" کا نام دیا جس کو معزز ارباب حکومت سرکار عالی نے منظور کیا اور خود اعلیحضرت سلطان العلوم، سلطان الشعراء خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ، نے اس اسکیم کو شرف پسندیدگی بخشا یہ اسکیم سہ سالہ تغیرات پر مبنی ہے جس کی تشریح ذیل میں کیجاتی ہے جو خود سراکبر کے دور وزارت مالیہ کے آخری سال ۱۳۴۶ف کی کیفیت موازنہ میں مندرج ہے اس سال کی کیفیت موازنہ میں خود اسراکبر نے اپنی اس اسکیم پر ایک تنقیدی نظر ڈالی ہے اور اس کی کامیابی کے ثبوت پیش فرمائے ہیں۔ اس کے بعد مرحوم کے جانشین وزراء کی آراء درج کیجائینگی جس سے اس اسکیم کے متعلق رائے قایم کرنے میں آسانی ہوگی۔

سراکبر نے فینانس کی وزارت کا جائزہ لینے ہی مالیہ کی اصلاح کے متعلق غور کرنا شروع کیا۔ اس غور و فکر کا جو نتیجہ نکلا اس کو ہم سراکبر کے ہی الفاظ میں پیش کرتے ہیں:-

"میں نے اپنے تقرر صدر المہامی فینانس کے بعد جو پہلا موازنہ ۱۳۳۱ف کے بابتہ پیش کیا تھا اُس میں اس اہکیم کے اہم نقاط نظر حسب ذیل فقرات میں ظاہر کئے تھے۔

"سررشتہ فینانس میں جن مسائل پر سال آیندہ مجھ کو غور و فکر کرنے کا خیال ہے اُن میں ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ مدات محاصل و مخارج کی جو تقسیم چلی آتی ہے اس پر نظر ثانی اس طور سے ہو کہ ہر ایک مد اپنے صحیح و مناسب موقع پر نظر آئے، اور مختلف سرمایہ جات محفوظ اپنے ذرائع وصول یا اغراض مصارف کے لحاظ سے جن کی بنا پر وہ قائم کئے گئے ہیں علحدہ علحدہ نامزد کے بجائیں اس نظر ثانی کی ایک غایت یہ بھی ہوگی کہ اغراجات کی غرض سے سرکار ابد قرار کے مالیہ کی تقسیم سررشتہ واری کردی جاوے جس کو میں سررشتہ واری انتظام مالیہ کے نام سے موسم کرسکتا ہوں ....

"اگر ..... جو سررشتہ زیادہ شور کرے اس کو زیادہ رقم ملجاوے تو اس اُصول کے برتنے میں اب سے دس پانچ برس پہلے البتہ عملی مشکلات پیش نہ آسکتی تھیں کیونکہ اس زمانے میں پانچ یا چھ کروڑ کے کُل مالیہ سے کروڑ ڈیڑھ کروڑ کی بچت ہوجاتی ایک معمولی بات تھی لیکن اب ایسا ممکن نہیں ..... آیندہ اختیار کرنے کے لئے جو اُصول اس وقت میرے ذہن میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ چند سال کے لئے ہر سررشتہ کے واسطے ایک مجموعی سالانہ رقم منظور فرمائی جاوے اور ہر ایسے سررشتہ کو اس مجموعی رقم کے اندر صرف کا ایک بڑی حد تک پورا اختیار بہ پابند ایسے عام قیود کے دیا جاوے جو غیر ضروری وسعت اختیارات اور نامناسب نظائر پیدا کرنے کی مانع ہوں ..... محاصل سرکار ابد قرار کو اس طرح سررشتہ وار تقسیم کرنے اور ہر سال ایسے واقعات کے لئے ایک گنجائش محفوظ کرنے کے بعد جن کا تحط کے مثل اپنے دور میں کسی نہ کسی وقت آنا ناگزیر ہے اگر کوئی فاضل رقم بچ رہے تو پھر اس کے بارے میں رائے دینا کہ وہ کس طرح مفید طور پر تقسیم ہوسکتی ہے سررشتہ فینانس کا ایک مسرت آمیز فرض ہوگا لیکن معمولاً اس بچت پر اس سررشتہ کا حق مرجع ہوگا جو اس کے پیدا ہونے کا موجب ہوا۔ اس کے بعد ان وسعت پذیر سررشتہ جات کا حق ہوگا جیسے کہ تعلیمات، حفظان صحت، تجارت، صنعت و حرفت، توسیع ذرائع آمد و رفت اور آبپاشی ہیں جو رعایا کی ذہنی، جسمانی اور معاشی نشو و نما کا باعث ہوسکتے ہیں۔ لیکن جب تک ایسی بچت فی الواقع خزانہ سرکاری میں داخل نہ ہوجاوے صدر المہام صاحبان علاقہ جات پر بھروسہ کیا جائے گا کہ مدت مقررہ کے لئے جو گنجائش معین کی گئی

ہیں، سالانہ اخراجات اُن کے اندر ہی رہیں۔"

اس کی مزید تشریح سر اکبر نے اس طرح فرمائی تھی:-

سبیل بندی مالیہ اس طریق عمل کے تحت جو اصول مضمر ہے وہ یہ ہے کہ تین سال کے اعداد آمدنی و خرچ کا غالب اندازہ حتی الامکان احتیاط اور صحت کے ساتھ قائم کیا جاتا ہے جو اُن تین سال کے پیش اندازوں کا ایک متعادی اندازہ ہوتا ہے۔ سالانہ تخمینے اُسی متعادی پر مبنی ہوتے ہیں جو بشاورۃ سررشتہ جات سال کے مخصوص اور نمایاں حالات پر غور کرنے کے بعد قایم کئے جاتے ہیں۔ بدوران تعہد جو سالانہ گنجائش سررشتہ جات کے لئے مہیا کی جاتی ہے وہ سال کے اختتام پر سوخت نہیں ہوتی۔ جو رقم غیر مقررفہ باقی رہ جاتی ہے وہ بحق سررشتہ جات جمع کر دی جاتی ہے۔ اور بوقت ضرورت استفادہ کے لئے موجود رہتی ہے البتہ وہ گنجائشیں جو تعہد سہ سالہ کے آخری دن تک غیر مقررفہ رہی ہوں اُن کی تضعیف عمل میں آتی ہے اور نصف حصہ پھر بحق سررشتہ جات متعلقہ جمع کر دیا جاتا ہے اور باقی نصف عام محاصل میں بازگشت ہو جاتا ہے۔

"اگر ضرورت ہو تو ہر تعہد سہ سالہ کے اختتام پر یا اُس کے قبل سالہائے ماسبق کی فاضلات عموماً بحق سررشتہ جات تقسیم کر دی جاتی ہیں اور یہ فاضلات خصوصاً اُن سررشتہ جات مثل سررشتہ تعمیرات کو بغرض تعمیر شوارع اور ایسے دوسررشتہ جات مثلاً تعلیمات، صحت عامہ، زراعت وغیرہ کو جو قومی تعمیر کے سررشتہ جات کہلاتے ہیں بغرض لوازم عمارات وغیر متوالی المکتفی بالذات نوعیت کے اخراجات کے لئے تقسیم کر دی جاتی ہیں۔

"مخصوص اغراض کی تکمیل کے لئے مخصوص محفوظات بھی قائم ہیں جن کو عام محاصل سے سالانہ رقم بطور متعادی گنجائش کے دیجاتی ہے۔ ان محفوظات کے استعمال کی اجازت اُسی وقت دی جاتی ہے جب کہ صرفہ عائد شدنی فی نفسہ انہی محفوظات کے قیام کی اغراض کے تحت ہو۔ چنانچہ محفوظ قحط اور محفوظ انفکاک قرضہ اسی قسم کے محفوظات ہیں۔ اس کے علاوہ محفوظ صنعتی بھی ہے جس کے سرمایہ سے ممالک سرکار عالی کے بڑی بڑی صنعتوں مثلاً معادن زغال و طلار کارخانہ جات سیمنٹ و پارچہ بافی کو مالی امداد دی جاتی ہے اور انوسٹمنٹ سے جو سالانہ جمع ہوتا ہے وہ پھر گھریلو صنعتوں، صنعتی پیشوں و ظائف تعلیم صنعتی وغیرہ کے دینے میں صرف کیا جاتا ہے۔ رقوم امانتی سیونگ بنک پٹہ پراویڈنٹ فنڈ ڈیمیہ اور اسی قسم کی دوسری امانتیں جن پر سرکار عالی کو سود ادا کرنے کی ذمہ داری ہے اُن کے لئے ایک علیحدہ محفوظ

ہے محفوظ استقامت سکہ عثمانیہ اور انسوسٹ منٹ محفوظ سکہ قرطاس دوسری نوع کے محفوظات ہیں اور وہ محاصل عامہ سے نہیں بلکہ تکنیک کے منافعوں اور خالص ترویج سکہ قرطاس کے ایک ثلث حصہ سے جو سخت قانون، انوسٹ کیا جاسکتا ہے قائم کی گئی ہیں۔

"یہ طریقہ ایک ایسے نظام العمل کا ضامن ہے جو کامل غور وخوض اور عاقبت اندیشی کے بعد مرتب کیا گیا ہے اور جس میں کفایت شعاری اور احتیاط کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس طریقہ عمل سے ایسے عاجلانہ اخراجات کی کثرت کی روک تھام ہوتی ہے جن پر اچھی طرح غور نہ کیا گیا ہو اور جہاں سال موازنہ کے اختتام پر خرچ کرنے والے محکمے گنجائشوں کے سوخت ہو جانے کے خوف سے ایسے اخراجات کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اگرچہ سررشتہ فینانس نے واضح طور پر اپنے لئے یہ حق محفوظ کر رکھا ہے کہ مالیہ کی عظیم حالت کی صورت میں اعتماد کے دوران میں بھی وہ مختلف سررشتہ جات کی گنجائشوں کو گھٹا سکتا ہے ہریں ہم سررشتہ فینانس نے اب تک اس اختیار سے کام نہیں لیا گزشتہ (۱۳) سال کے دوران میں سررشتہ جات متعلقہ سے جو سہ سالہ تعہدات کئے گئے تھے اُن کو نہ صرف کبھی توڑا گیا بلکہ محکمہ جات متعلقہ سے کافی معقول وجوہ پیش ہونے پر سرکار عالی نے غیر معمولی مصارف کے لیئے اُن کی مقررہ اور تعہد کی گنجائشوں کے علاوہ مزید گنجائش بھی منظور فرمائی۔

"ممالک محروسہ سرکار عالی کا رقبہ (۸۲۶۹۸) مربع میل اور آبادی بلحاظ مردم شماری ۱۹۳۱ء (۱۴۴۳۶۱۴۸) نفوس پر مشتمل ہے۔ اعلیحضرت بندگان عالی متعالی کے فیض رساں اور مدبرانہ دور حکومت میں حیدرآباد کو بفضلہ مالی حالات کے مدنظر جو اس وقت میرے پیش نظر ہیں ایک امتیازی شان حاصل رہی ہے کیونکہ اس ریاست کا مواد باوجود عالمگیر اقتصادی پستی کے متوازن آیا ہے موجودہ محصولات میں اضافہ اور جدید محصولات عائد کئے بغیر سال بسال فاضلات رونما ہوتی ہی ہیں۔ فی الحقیقت اس وقت تک قحط اور اسی قسم کے دوسرے مصائب کے مواقع پر غیر معمولی طور پر مالگزاری اراضی میں معتدبہ معافیاں عطا کی گئیں اور محصول کروڑگیری میں بھی تخفیف کی جاتی رہی۔ علاوہ ازیں سال کے اختتام پر سررشتہ جات کی جو بچتیں رونما ہوئیں ہیں اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ سررشتہ جات کو مصارف کے لئے رقم مہیا کرنے میں دریغ نہیں کیا گیا بلکہ اُن کے پاس خرچ کے لئے ضرورت سے زیادہ رقوم موجود تھیں"

سررشتہ داری سیل بندی مالیہ کی اسکیم کے متعلق نواب فخر یار جنگ بہادر کی رائے

سررشتہ داری سیل بندی مالیہ کی اسکیم اپنے آغاز کے لئے عالیجناب رائٹ آنریبل سراکبر حیدری کے تدبر اور مالیاتی فراست کی مرہون منت ہے۔ اس دانشمندی کے ساتھ سوچی اور احتیاط کے ساتھ ترتیب دی ہوئی اسکیم سے ریاست حیدرآباد کو ایک مستحکم و استوار مالیاتی نظام حاصل ہوگیا ہے۔ قواعد سیل بندی اور وہ روایات جو اس ضمن میں منشار قواعد کے مطابقت میں قائم ہوچکی ہیں مقامی حالات کے لئے ازبس سازگار ثابت ہوئیں اور زمانے کی آزمائش پر باحسن الوجوہ پوری اتری ہیں اُن کی وجہ سے ایک ایسا نظام قائم ہوچلا ہے جو سررشتہ جات کی جانب سے اپنے نظام العمل کی ترتیب میں ایسی پیہم سعی اور کوشش کے کئے جانے کا ضامن ہے جس کی وجہ سے اس قسم کے اسراف کے رجحان کا سدباب ہوجاتا ہے جو بجائے سہ سالہ کے ہر سال کے لئے ایک جدید موازنہ مرتب کئے جانے کے طریقے کا ناگزیر نتیجہ ہے جن کے تحت اس سال کی رقوم مشترکہ موازنہ اُس سال کے اختتام پر سوخت ہوجایا کرتی ہیں ہر سہ سالہ تعہد کے آغاز پر اس تمادی آمدنی کا جو زمانے تعہد کے لئے ضروری خیال کی جاسکتی ہے امکانی صحت کے ساتھ ایک اندازہ مرتب ہوتا ہے اور اس اندازہ کی رہنمائی میں سررشتہ جات کے ساتھ موازنہ میں اُن شریک شدنی رقوم کے تعین کا معاہدہ کیا جاتا ہے جن کے تعہد سہ سالہ کی مدت میں اقل ترین رقم کے طور پر جاری رہ سکنے کی ضمانت کی جاسکتی ہو الا اس صورت کے کہ اس اثنا میں کوئی اہم مالی ناگہانی صورت رونما ہو، جو بحمداللہ گزشتہ پندرہ سال میں کبھی رونما نہیں ہوئی ..... اس دور اندیشانہ مالیاتی نظام کے قالب آہنی کے اندر اور سررشتہ جات کی نشوونما کے لئے نہایت وسیع گنجائش ہے اور اگرچہ از روئے قواعد اُن کو کسی سہ سالہ تعہد کے دوران میں جدید رقوم طلب کرنے کا استحقاق نہیں ہے بریں ہم اس اثنا میں اگر اپنی کسی غیر متوقع ضروریات کا جواز ثابت کرسکتے ہیں تو ان کی پابجائی کی سررشتہ فنانس حتی الامکان کوشش کرتا ہے۔ یہ موقع کہ سررشتہ جات کے ساتھ رقوم کا معاہدہ فیاضانہ طور پر کیا جاتا ہے اس بات سے بخوبی واضح ہوگا کہ غیر مستثنیٰ رقوم کی مقدار جن کا نصف حصہ سررشتہ جات کے حق میں دوسرے تعہد سہ سالہ میں مکرر شریک کیا گیا ہے تعہد ۱۳۳۲ف تا ۱۳۳۴ف میں (۶۹ر۳۵) لاکھ روپیہ تا ۱۳۳۵ف تا ۱۳۳۷ف فصلی میں (۹۱ر۳۵) لاکھ ۱۳۳۸ف تا ۱۳۴۰ف میں (۹۹ر۸۵) لاکھ ۱۳۴۱ف تا ۱۳۴۳ف میں

(۵۰۱۰۱) لاکھ تھا اور توقع کی جاتی ہے کہ ۱۳۴۴ف تا ۱۳۴۶ف میں اس کی مقدار (۷۸۷۷۷) لاکھ ہوگی۔ اُن فاضل رقوم کو جو سال بہ سال رونما ہوتی ہیں ایک ایک پائی سررشتہ جات کے ضروری ساز و سامان کے لئے اور افادۂ مفاد عامہ کے کاموں میں زائد غیر متوالی رقوم کی شکل میں صرف کر دیجاتی ہیں۔ مملکت حیدرآباد کے مالیہ کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ اس کے تحت ایسی صورت واقع نہیں ہوسکتی کہ کسی سال میں خرچ آمدنی سے تجاوز کر جائے۔ فاضل رقوم کو اُن کے حقیقی طور پر جمع ہو جانے سے قبل ہاتھ تک نہیں لگایا جاتا۔ کارہائے سرمایہ اور تجارتی امور کے مصارف کی فراہمی کے واسطے قرضہ جات اس وقت تک نہیں حاصل کئے جاتے جب تک تاریخ انفکاک سے قبل ہی اُن کی کامل ادائی کے واسطے مدادائی قرضہ کے تحت موازنہ میں موزوں گنجائش رکھنے کا انتظام نہ کر لیا جائے"

سررشتہ واری سیل بندی مالیہ کی اہم سکیم متعلق نواب مہدی یار جنگ بہادر کی رائے

"..... سررشتہ واری سیل بندی مالیہ ..... مملکت سرکار عالی کی مسلسل ترقی اور مالی استحکام کی ۱۳۳۲ف سے کفیل رہی ہے ہے جب کہ عالیجناب رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری (نواب حیدر نواز جنگ بہادر) نے اس کی ابتدا فرمائی تھی۔ ممدوح اشان نے بحیثیت صدر المہام فینانس من ابتدا ۱۳۳۳ف لغایت ۱۳۴۳ف نہ صرف شاندار کامیابی کے ساتھ مملکت سرکار عالی کے جہاز مالیہ کی ناخدائی فرمائی ہے بلکہ اپنے جانشینوں کے لئے ایک ایسا طریقۂ عمل قائم کیا ہے جو اُن کے لئے خضر راہ کا کام دیگا"

"ہمارے موازنے کی نمایاں خصوصیت جو نظر انداز نہیں ہوسکتی یہ ہے کہ سقامت کے اس زمانے میں بھی سرکار عالی نے ملک کی ترقی میں کوئی جمود روا نہیں رکھا ہے بلکہ ملک کی ترقی پذیر ضرورت کی تکمیل کے لئے فراہمی رقم کی تدابیر کر مہیا کی ہیں"

سررشتہ واری سیل بندی مالیہ کی اہم سکیم عمل میں ۱۳۴۱ف تا ۱۳۴۶ف کے اہم مدات خرچ

یہاں پر اس قدر گنجائش نہیں ہے کہ اس اسکیم پر پوری طرح تبصرہ کرتے ہوئے مدات آمدنی میں اضافہ اور طریقۂ اضافہ کے محاسن و معائب پر بحث اور مدات خرچ پر تنقید کی جائے لہٰذا اختصار کی خاطر یہاں پر صرف ایک لکین طویل جدول پیش کیا جاتا ہے

جس میں قومی تعمیر کے سررشتہ جات پر خرچ شدہ رقمیں حصول مقاصد کے پیش نظر درج کیجاتی ہیں۔ ان مدات کا مقابلہ ۱۳۴۱ف تا ۱۳۴۶ف کے مدات سے کیا جاسکتا ہے جس سے واضح ہوگا کہ اس خرچ میں کس قدر اضافہ ہوا:۔

(جملہ رقومات لاکھ روپیہ سکۂ عثمانیہ میں دی گئی ہیں)

اہم مدات خرچ	۱۳۴۱ف	۱۳۴۲ف	۱۳۴۳ف	۱۳۴۴ف	۱۳۴۵ف	۱۳۴۶ف
تعلیمات	۹۰٫۵۱	۹۸٫۲۰	۱۱۶٫۴۴	۱۰۷٫۱۱	۱۰۳٫۷۳	۱۰۴٫۶۱
طبابت وصحت عامہ	۲۹٫۰۵	۲۹٫۳۶	۲۸٫۸۱	۲۹٫۱۱	۲۸٫۱۷	۲۹٫۵۸
زراعت	۷٫۲۸	۸٫۵۵	۸٫۳۱	۷٫۹۴	۸٫۰۶	۷٫۰۹
علاج حیوانات	۴٫۴۳	۴٫۷۲	۴٫۸۹	۴٫۸۲	۴٫۷۸	۴٫۷۶
انجمن امداد باہمی	۳٫۶۶	۳٫۸۹	۴٫۰۰	۴٫۰۶	۴٫۴۲	۴٫۳۵
بلدیات وزرعیات عامہ	۴۹٫۵۶	۵۱٫۸۶	۳۷٫۴۱	۲۰٫۰۳	۲۰٫۸۵	۲۰٫۴۶
تعمیرات ورسل ورسائل	۹۳٫۰۶	۶۹٫۴۲	۶۸٫۹۶	۶۶٫۰۷	۶۸٫۲۱	۷۵٫۴۱
آبپاشی	۱۲٫۲۶	۱۰٫۸۶	۱۱٫۴۵	۹٫۳۶	۸٫۰۱	۷٫۴۵
صنعت وحرفت	۳٫۲۲	۳٫۱۱	۴٫۰۲	۳٫۳۷	۳٫۳۸	۳٫۴۸
قحط فنڈ	۱۹٫۰۵	۱۸٫۵۱	۱۸۰۳	۲۵٫۱۳	۲۶٫۷۹	۲۵٫۹۱

سر اکبر کے دور کے ہر سال مالیہ کے حالات اور مالیہ کے احتکام کا مطالعہ باعث طوالت ہوگا اس لئے یہاں پر سر اکبر کے دور مالیہ کے آخری تین سال یعنی ۱۳۴۴ف، ۱۳۴۵ف اور ۱۳۴۶ف کے حالات و مالیہ پر ایک مختصر نوٹ لکھا جاتا ہے جس سے یہ واضح ہوگا کہ سر اکبر کی جدوجہد سے ملک کا مالیہ اُن کے آخری دور وزارت میں کس قدر مستحکم ہوگیا تھا ہمارے مالیہ کے احتکام کا ایک بدیہی ثبوت یہ ہے کہ جنگ کے بلاواسطہ بار کو مالیہ حیدرآباد بلا کسی

قسم کے اضافہ یا جدید ٹیکس عائد کئے برداشت کر رہا ہے۔ ایک طرف تو جنگ کے بلا واسطہ اخراجات ہیں اور دوسری طرف عام گرانی کا دور دورہ ہے۔ لیکن مالیہ حیدرآباد ان کے باوجود بھی اپنی جگہ مستحکم ہے۔ قومی تعمیر اور فلاح و بہبود کے مدات خرچ میں کمی تو کجا، اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔

۱۳۴۴ف کے عام حالات اور ہمارے موازنہ کی کیفیت

یہ سال سہ سالہ سیل بندی مالیہ (۱۳۴۴ف-۱۳۴۶ف) کا پہلا سال تھا۔ اس کے تحت مسلسل تین سالوں میں ہر سال (۹۶ر۸۵۲) لاکھ آمدنی، (۱۱ر۸۲۴) لاکھ کی بچت کا تخمینہ تھا۔ لیکن ۱۳۴۴ف کی حقیقی آمدنی (۰۱ر۸۴۲) لاکھ خرچ (۸۷ر۸۲۸) لاکھ اور بچت (۱۴ر۱۳) لاکھ ہوئیں اس کے مختلف اسباب تھے۔ حیدرآباد دنیا کی اقتصادی پستی سے مامون نہ رہ سکا۔ بارش کی غیر مساوی تقسیم کے باعث فصلیں خراب رہیں اس کی وجہ خاص ذرائع آمدنی، مالگزاری اور کروڑگیری وغیرہ میں کمی ہوئی۔ زراعت پیشہ لوگ جو پیداوار کی قیمتوں کی کمی کے باعث مبتلائے آلام تھے۔ اُن کی امداد کے لئے مالگزاری اراضی میں معتدبہ معافیات دی گئیں۔ کروڑگیری کا انحصار ملک کی برآمد پر تھا جو زراعت کے نامساعد حالات کی وجہ سے متاثر ہوئی۔ ان حالات کے باوجود سراکبر کے تدبر اور قابلیت کی بدولت ملک کا مالیہ اس قابل تھا کہ متوقع خرچ کے علاوہ (۰۷ر۲۱) لاکھ کی غیر معمولی منظوریاں دے۔ جن میں علمی، خیراتی، تعمیری منظوریوں کے علاوہ لاسلکی اور سیول ہوابازی کے محکموں کا قیام تھا۔ گزشتہ سہ سالہ فاضلات کو بجائے کسی دوسرے کام میں لے کر متوقع آمدنی کی کسر پوری کرنے کے سراکبر نے ان فاضلات کو ترقیات عامہ اصلاحات آبرسانی بلدہ، ڈرینج اور عمارات کے لئے صرف کیا جس میں تعمیرات جامعہ کو ۲۸ لاکھ روپئے دیئے گئے اس معتدبہ رقم سے جامعہ عثمانیہ کی عمارات کی تعمیر میں خاصی ترقی ہوئی اور چند سو طلبار کے قیام کے لئے رہائش کا انتظام ہو سکا۔

۱۳۴۵ف کے عام حالات اور ہمارے موازنہ کی کیفیت

اس سال بھی معتادی آمد و خرچ اور فاضلات وہی تھے جو ۱۳۴۴ف میں طے کئے گئے تھے۔ لیکن عرصہ موازنے کی رو سے آمدنی (۱۸ر۸۷۳) لاکھ خرچ (۱۰ر۸۵۲) لاکھ اور فاضلات (۰۸ر۲۱) لاکھ کی توقع کی گئی تھی۔ فاضلات ۱۳۴۴ف کے فاضلات حقیقی سے بہت زیادہ ہیں آمدنی میں جو اضافہ کی توقع

تھی وہ تین مدات خاص میں رونما ہونے والی تھی جس میں مالگزاری، کروڑگیری اور آبکاری تھے۔ اس کی وجہ خراب موسمی حالات اور آبکاری کی اصلاحات تھیں۔ ان کے علاوہ دیاسلائی، افیون، جنگلات سے بھی زیادہ آمدنی کی توقع تھی۔ سرکاری فاضلات کے سود میں بھی اضافے کا امکان تھا۔ ریلوے اپنے سرمایہ (۱۷½) کروڑ روپیہ پر ۱۳۴۵ف میں (۵۲ر۱۰۹) اور ۱۳۴۶ف میں (۴۳ر۱۰۶) لاکھ آمدنی دیرہی تھی۔

خرچ جو (۱۰ر۵۲) لاکھ تھا اس میں سررشتہ واری بچت سابقہ (۸۹ر۶۹) لاکھ تھی جس کے معنی یہ ہوئے کہ حقیقی صرف جس کا اندازہ کیا گیا تھا صرف (۲۱ر۸۲) لاکھ تھا۔ اس سال بھی غیر معمولی منظوریاں دی گئیں جس کی مقدار (۳۸) لاکھ تھی جس میں اہم نشر الصوت پر (۲) لاکھ سکی اسٹیشن کی تعمیر پر (۱½) لاکھ ہوائی پرواز کے کلب کے لئے (۱½) لاکھ دیئے تھے۔

۱۳۴۶ف کے عام حالات اور موازنے کی کیفیت

اس سال متوقع آمدنی (۵۶ر۸۶۹) لاکھ، خرچ (۳۸ر۸۴۷) لاکھ اور بچت (۱۸ر۲۲) لاکھ تھی۔ یہ موازنہ آمدنی ۱۳۴۶ف بمقابل موازنہ ۱۳۴۵ف کے (۶۴ر۱۳) لاکھ زائد ہے۔ خرچ میں دو اہم مدات محفوظ فنڈ اور محفوظ انہدام قرضہ شامل ہیں۔ جس میں بالترتیب (۰۰ر۱۵) لاکھ اور (۶۸ر۱۸) لاکھ علحدہ کئے گئے زائد متوقع آمدنی میں کروڑگیری سے (۳۵ر۶) زائد اور روڈ فنڈ کے تحت فیس رجسٹری لائسنس سے (۶۰ر۲) لاکھ کی وصول کی توقع تھی۔ لحس سواری کی مرکب جدید مد سے ہے۔ جس کی ضرورت اس لئے لاحق ہوئی کہ جدید موٹر ٹرافک کی ضروریات کی سہیل کے واسطے ایک روڈ فنڈ قائم کیا جائے جو ضروری مصارف کی پابجائی کے بعد تعمیر شوارع پر صرف کیا جائے گا۔

ابواب سرکاری کے جملہ مصارف رقمی (۳۸ر۸۴۷) لاکھ میں بعض ایسی مدات بھی شامل تھیں جو ریاست کی معاشی ترقی پر انداز ہوتی ہیں۔ ہوائی پرواز کے لئے (۷) لاکھ، نشر الصوت کے لئے (۵) لاکھ مختص کئے گئے ہیں پر اس قدر کثیر رقوم کے صرف کرنے کا منشا یہ تھا کہ یہ تیز رفتار ذریعہ آمد و رفت حیدرآباد کی پبلک کو حاصل ہو جائے گا اور فن پرواز کے شوقین ماہرین کی رہنمائی میں تعلیم حاصل کر سکیں گے۔ ساتھ ہی یہ بھی تجویز تھی کہ نظام اسٹیٹ ریلوے کی نگرانی میں تجارتی اصول پر ایک ہوائی سرویس قائم کی جائے۔

امکنہ رہایش کے لئے پانچ لاکھ مخصص کئے گئے جس میں سے دو لاکھ سیول ایک لاکھ فوجی عہدہ داروں اور باقی دو لاکھ جامعہ عثمانیہ کے اسٹاف کے رہایشی مکانات کی تعمیر کے لئے دئے گئے بیڑ، پرلی ریلوے لائن کے لئے (۶۷، ۶۷) لاکھ علٰحدہ رکھے گئے۔ سات لاکھ روڈ میکانیکل ٹرانسپورٹ سرویس کی توسیع کے لئے تھے۔ سراکبر کی یہ کوشش قابل ستائش ہے۔ کیونکہ اس کی وجہ سے حیدرآباد کو ریل و سڑک میں ہم آہنگی پیدا کرنے میں امتیاز حاصل ہوگیا۔ سراکبر کی خواہش تھی کہ اسکے ساتھ ہی ہوائی سرویس بھی قائم ہوجائے تاکہ یہ تینوں وسائل ایک ہم آہنگی سے کام کرسکیں۔

پروگرام تعمیر امکنہ

تعمیر امکنہ کے بارے میں سراکبر بہت فراخ دل واقع ہوئے تھے۔ اور کسی حال میں بھی اس کام کو روکنا پسند نہ کرتے تھے۔ اور ان کا قدر کسی نہ کسی طرح اس کی گنجائش نکال لیتا تھا۔ اس کا اندازہ سراکبر کے مندرجہ ذیل نوٹ سے ہوگا:۔ ..... عثمانیہ یونیورسٹی کی تعمیر ہر کیف مکمل کرنی ہے۔ اور دارالحکومت میں موزوں موقع پر سنٹرل سکریٹریٹ نیز قیام امن کے مدنظر اضلاع میں پولیس بارکوں کی تعمیر کی نسبت بھی حکومت کو نہایت دلچسپی ہے۔ ان تعمیری کاموں کو سرانجام کرنے والے ذمہ دار حکام قدرتاً سررشتہ فینانس کے ایما کے منتظر ہیں کہ کس حد تک اور کس طریقہ سے رقم کی سبیل کیجائے گی۔ تاکہ اس کی مناسبت سے وہ اپنا کام آغاز کرسکیں۔ سررشتہ فینانس آمادہ ہے کہ آئندہ چار سال کے لئے عثمانیہ یونیورسٹی کے لئے (۱۵۰) لاکھ روپے سالانہ اور اضلاع پولیس کی بارکوں کے لئے (۱۰) لاکھ اور ختم تعمیر تک سنٹرل سکریٹریٹ کے لئے (۷) لاکھ فراہم کرے۔ اس نقطۂ نظر سے کہ آئندہ تعہد میں متعادی گنجائش تعمیر امکنہ متاثر نہ ہو یہ تجویز کی جاتی ہے کہ ان اخراجات کی سبیل کچھ تو فاضلات سنین ماضیہ سے لیکن بیشتر حصہ موزوں موقع پر سرکاری قرضہ کے اجرائے سے فراہم کیا جائے اور موازنہ میں سود اور سنکنگ فنڈ کے لئے ضروری گنجائش رکھی جائے۔ اس گنجائش کی سبیل بہ آسانی ممکن ہے کیونکہ جب محفوظ قحط مین کروڑ تک پہنچ جائے گی تو ہر سال پندرہ لاکھ کی رقم حواس محفوظ کو دیجاتی ہے موقوف ہوگی۔ یہ مناسب نہ ہوگا کہ اس قسم کی منتقل نوعیت کی عمارات کی تعمیر کا بار آئندہ نسلوں کو اس کی پائیجائی میں شریک کئے بغیر کلیتہً صرف موجودہ نسل پر عائد کیا جائے۔" اس خیال کے تحت سراکبر نے قرض حاصل کئے اس مقدار کا اندازہ جو سراکبر نے قرض لیا ۱۳۲۹ف کے قرض کے اعداد کو دیکھنے سے واضح ہوگا جو اس سے پہلے پیش کئے گئے۔ بقول نواب فخر یار جنگ بہادر یہ قرضے اس وقت تک حاصل نہیں کئے جاتے جب تک تاریخ انفکاک سے قبل ہی ان کی کامل ادائی کے واسطے مدادائی

قرضہ کے تحت موازنہ میں موزوں گنجائش رکھنے کا انتظام کرلیا جائے قرضوں کی تفصیل جو سر اکبر کے دورِ وزارت کے آخری سال حکومت سرکار عالی کے ذمے تھی وہ حسب ذیل ہے :۔

سلسلہ نمبر	نوعیت قرضہ	اصل رقم جو حاصل کی گئی	۱۳۴۶ف میں قابل ادائی رقم
		سکہ عثمانیہ	سکہ عثمانیہ
۱	پرامیسری نوٹ سرکار عالی سودی (۶) فیصدی		
	الف۔ مجریہ ۱۳۰۰ف اداشدنی بعد ۳۰ آبان ۱۳۲۶ف	۲۶۹۶۴۰۰	۱۶۰۰
	ب۔ مجریہ ۱۳۲۷ف		
	(۱)۔ قلیل المیعاد ۱۳۳۰ف	۱۲۹۰۶۵۰	۲۲۲۵۰
	(۲)۔ طویل المیعاد ۱۳۳۹-۴۰ف	۷۰۴۴۶۵۰	۱۹۱۴۰۰
	ج۔ مجریہ ۱۳۳۹ف اداشدنی یکم بہمن ۱۳۵۱ف	۱۰۲۰۸۸۰۰	۱۰۲۰۸۸۰۰
	د۔ مجریہ ۱۳۳۱ف اداشدنی ۶۱-۱۳۵۱ف	۷۶۳۱۲۰۰	۷۶۳۱۲۰۰
۲	پرامیسری نوٹ (۵½) فیصد ۱۳۴۱ف۔ اداشدنی ۶۲-۱۳۵۲ف	۳۹۸۴۳۳۰۰	۳۹۸۴۳۳۰۰
۳	پرامیسری نوٹ (۳½) فیصد ۱۳۴۴ف اداشدنی ۶۵-۱۳۵۵ف	۱۴۴۴۱۱۰۰	۱۴۴۴۱۱۰۰
۴	حصص ریلوے قدیم	۵۲۲۷۶۶۵	۳۴۰۳۷۱۹

ان قرضوں کے بالمقابل محفوظ ادائی قرضہ کی مد میں تمسکات سرکار عظمت مدار و علاقہ جات صفائی اور اسٹرلنگ تمسکات میں (۲۱۱۵۰۶۸۳) سکہ عثمانیہ کی رقومات لگی ہوئی تھیں اور ۱۳۴۴ف محفوظ ادائی قرضہ میں (۱۳٫۵) لاکھ جمع کئے گئے۔ ۱۳۴۵ف میں (۱۸٫۶۸) ۱۳۴۷ف میں (۲۰٫۴۴) اور ۱۳۴۸ف میں (۲۰٫۳۴) لاکھ ۱۳۴۹ف میں (۲۱٫۰۰) لاکھ دئے گئے۔

یہ سارے حالات جس مسلک کا نتیجہ تھے۔ وہ نواب فخر یار جنگ بہادر کی اس تحریر سے واضح ہوگا۔ اگر ہم اس مسلک کی پیہم پابندی کرتے رہیں جیسا کہ اسوقت تک کی جارہی ہے کہ وسائل و ذرائع آمدنی کے مدنظر ہی اضافہ

خرچ کی سبیل کی جائے تو مالیہ حیدرآباد کا استحکام یقیناً اسی طرح غیر متزلزل حالت میں رہے گا۔" خود سراکبر کا خیال تھا کہ اعلیحضرت کی حکومت مالی استواری کا "عہد زرین ہے"۔ جس میں رعایا کی خوشحالی میں اضافہ ہوا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ حیدرآباد کو اپنے مالیہ کی استواری کی شہرت حاصل ہے"۔ اور جس کا سہرا سراکبر اور ان کے رفقائے کار کے سر ہے۔

ضمیمۂ اوّل

شاہانِ آصفی (دورِ حکومت)

سلسلہ نمبر	فرمانروائے مملکت اصفیہ		سنہ ابتدائی دور حکومت	سنہ اختتام دور حکومت
۱	۲		۳	۴
۱	نواب میر قمرالدین علی خاں	حضرت آصفجاہ اوّل	۱۱۳۳ ہجری	۱۱۶۱ ہجری
۲	نواب ناصر جنگ		۱۱۶۱ "	۱۱۶۴ "
۳	نواب مظفر جنگ	(صرف دو ماہ حکومت کی)	۱۱۶۴ "	۱۱۶۴ "
۴	نواب صلابت جنگ		۱۱۶۴ "	۱۱۷۵ "
۵	نواب میر نظام علیخاں	آصفجاہ ثانی	۱۱۷۵ "	۱۲۱۸ "
۶	نواب میر اکبر علی خاں سکندر جاہ	" ثالث	۱۲۱۸ "	۱۲۴۴ "
۷	نواب میر فرخندہ علیخاں ناصر الدولہ	" رابع	۱۲۴۴ "	۱۲۷۲ "
۸	نواب میر تہنیت علی خاں افضل الدولہ	" خامس	۱۲۷۲ "	۱۲۸۵ "
۹	نواب میر محبوب علیخاں	" سادس	۱۲۸۵ "	۱۳۲۹ "
۱۰	نواب میر عثمان علیخاں بہادر	خلداللہ ملکہٗ وسلطنتہٗ	تخت نشینی مبارک سنہ ۱۳۲۹ھ	

ضمیمۂ دوم

وزرائے عظام مملکت آصفیہ

	وزیر اعظم (صدر اعظم)	تاریخ سرفرازی عہدہ	تاریخ علیحدگی
۱	۲	۳	۴
۱	راجہ رگھوناتھ داس	۱۱۶۴ ہجری	۱۱۶۶ ہجری
۲	سید لشکر خاں	۱۱۶۶ ″	۱۱۶۹ ″
۳	شہنواز خاں	۱۱۶۹ ″	۱۱۷۲ ″
۴	نواب صلابت جنگ	۱۱۷۲ ″	۱۱۷۵ ″
۵	راجہ پرتاب دنت	۱۱۷۵ ″	۱۱۷۷ ″
۶	سید لشکر خاں	۱۱۷۷ ″	۱۱۸۹ ″
۷	نواب صمصام الملک ذوالفقار الدولہ	درمیانی تغیرات نامعلوم	
۸	ارسطو جاہ	۱۱۹۸ ″	۱۲۱۹ ″
۹	میر عالم	۱۲۱۹	۱۲۲۳ ″
۱۰	نواب میر الملک	۱۲۲۴	۱۲۴۸ ″
۱۱	چندو لال	۱۲۴۸	۱۲۴۹ ″

۱۲	سراج الملک	۱۲۶۲	۱۲۶۴ ہجری
۱۳	سیف جنگ	۱۲۶۴	۱۲۶۵
۱۴	شمس الامراء	۱۲۶۵	۱۲۶۵
۱۵	رام بخش	سال نامعلوم۔ درمیانی تغیرات ناقابل حصول	
۱۶	سراج الملک	۱۲۶۷	۱۲۶۹
۱۷	سالار جنگ اولیٰ	۱۲۶۹	۱۳۰۰
۱۸	زندر بہادر	۱۳۰۰	۱۳۰۱
۱۹	سالار جنگ ثانی	۱۳۰۱	۱۳۰۴
۲۰	آسمان جاہ	۱۳۰۴	۱۳۱۱
۲۱	وقار الامراء	۱۳۱۱	۱۳۱۹
۲۲	مہاراجہ سرکشن پرشاد یمین السلطنت		
۲۳	نواب سالار جنگ ثالث		
۲۴	سر علی امام نواب موید الملک	۱۳۲۸ف	۱۳۳۱ف
۲۵	سر فریدون الملک	۱۳۳۱ف	۱۳۳۳ف
۲۶	نواب ولی الدولہ	۱۳۳۳ف	۱۳۳۶ف
۲۷	مہاراجہ سرکشن پرشاد یمین السلطنت	۲۳ر دے ۱۳۳۶ف	۹ر اردی بہشت ۱۳۴۶ف
۲۸	سر اکبر حیدری نواب حیدر نواز جنگ بہادر	۹ر اردی بہشت ۱۳۴۶ف	۲۶ر مہر ۱۳۵۰ف
۲۹	سر محمد احمد سعید خاں (نواب چھتاری)	۲۶ر مہر ۱۳۵۰ف	

۱؎ سر اکبر حیدر نواز جنگ بہادر اس سے کچھ دن قبل ہی دہلی روانہ ہو گئے تھے۔

ضمیمۂ سوم

صدر المہامین محکمۂ فینانس (مع تاریخ تقرر و علیحدگی)

نمبر شمار	نام صدر المہام	تاریخ جائزہ تقرر	تاریخ جائزہ علیحدگی
۱	۲	۳	۴
۱			
۲	آر۔ آئی۔ آر گلانسی		۳۰ ر امرداد ۱۳۳۰ف
۳	سر اکبر حیدری نواب حیدر نواز جنگ بہادر	۳۰ ر امرداد ۱۳۳۰ف	۹ ر اردی بہشت ۱۳۴۶ف
۴	نواب فخر یار جنگ بہادر	۹ ر اردی بہشت ۱۳۴۶ف	۲۹ ر بہمن ۱۳۴۸ف
۵	نواب مہدی یار جنگ بہادر (منصرم)	۲۹ ر بہمن ۱۳۴۸ف	۹ ر تیر ۱۳۵۱ف
۶	مسٹر غلام محمد	۹ ر تیر ۱۳۵۱ف	

انوار احمد صدیقی
سال چہارم

آرٹ اور سراکبر کی زندگی

مدیر صاحب حضنہ انگریزی نے سراکبر مرحوم کے متعلق مجھ سے اپنے تاثرات لکھوالئے۔ اب مدیر صاحب حصہ اُردو کی باری آئی۔ انھوں نے بھی کچھ نہ کچھ لکھنے کی فرمائش کردی اب میرے لئے اس کی تکمیل اس لئے دشوار ہے کہ میں نے انگریزی زبان کے مضمون میں واضح طور پر اپنے ارتسامات پیش کردئے تھے، جو کچھ لکھنا تھا لکھ دیا تھا۔ اب سوچتا ہوں کیا لکھوں۔ یکایک یاد آیا کہ اسی مضمون میں ایک جگہ میں نے سراکبر کا ذکر آرٹ کے سرپرست کی حیثیت سے کرتے ہوئے آرٹ اور زندگی پر کچھ تفصیلی اظہار خیال کا شوشہ سا چھوڑا تھا۔ اس وقت "زرہ امتثال امر" اس کی تکمیل کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔

سراکبر کو میں نے جب دور سے دیکھا، تو مجھے انھیں قریب تر دیکھنے کا موقعہ ملا، کیونکہ میرے خیالات پر اُن کے تقرب کے وہ اثرات، اور اُن کی نزدیکی کے وہ پردے نہ پڑسکے جو عام طور پر معاصبین اور معتقدین کی نگاہوں پر پڑتے ہیں۔ اس دوری میں میں نے دیکھا کہ سراکبر کو آرٹ سے ایک قلبی محبت ہے، اور وہ چاہتے ہیں کہ آرٹ کو اس طرح نہ استعمال کریں جس طرح عام طور پر اُمراء نمائش اور آرائش کے طریقے پر استعمال کرتے ہیں۔ مہاراجہ بہادر آنجہانی آرٹ کے اس قدر شیدا تھے کہ انھوں نے تو خود مصوری، شاعری اور موسیقی میں حصہ لیا تھا۔ سراکبر کے متعلق مجھے علم نہیں کہ کس فن لطیف میں عملاً دخل تھا، لیکن میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ وہ ارٹ کو بہت اچھی طرح پہچانا پھولنا، کیفنا چاہتے تھے۔

علم کے بعض شعبے ایسے ہوتے ہیں جن میں خاصہ درک حاصل کرنے کے لئے اُن کے باقاعدہ مطالعے اور ان کے ساتھ خاص انہماک کی ضرورت ہوتی ہے، ان میں سے ایک آرٹ بھی ہے۔ آرٹ کی ایک نمایاں خصوصیت

یہ ہے کہ وہ کسی طرح اکتسابی نہیں ہوتا۔ سائنس میں انسان اپنی عقلی قوتوں سے کام لے سکتا ہے، لیکن آرٹ میں جب تک اس کے سمجھنے، اس سے لطف اٹھانے، اسے حاصل کرنے کی فطری صلاحیت نہ ہو، محنت، اکتساب اُس میں وہ رنگ پیدا نہیں کر سکتا۔ آرٹ ایک ذوق کی چیز ہے، سائنس عقلی برتری کے اظہار کا ایک واسطہ ہے۔ آرٹ میں انسان کا دل جب تک نہ بولے، وہ آرٹ نہیں کہلا سکتا، اور سائنس میں عقل کی جدت طرازیاں، دل کی سرگوشیوں پر حاوی آئے بغیر نہیں رہتیں۔ اُمرا کے لئے اور خصوصاً سراکبر جیسی معروف ہستیوں کے لئے اتنا وقت نہیں ملتا کہ وہ آرٹ سے یکسوئی کے ساتھ تعلق پیدا کر لیں اور اس کی ہو کر رہ جائیں۔ ایسے موقعوں پر جو چیز اُن کی مدد کر سکتی ہے وہ آرٹ کا ماحول ہے، لیکن افسوس ہے کہ حیدرآباد میں آرٹ کا وہ ماحول نہیں ہے جو ہونا چاہیئے۔ سراکبر کو اس ماحول نے خواہ کتنا ہی مطمئن کیا ہو، لیکن تنقیدی نگاہیں اس کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ علمی تنقید طرفداری نہیں جانتی، کام چلانے سے آشنا نہیں ہوتی، ذاتی اغراض، اور اکتساب شہرت سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی۔ وہ ایک آئینہ ہوتی ہے، جس میں ہر شخص کا چہرہ، ہر چیز کا عکس اپنے حسن و قبح کے ساتھ صاف نظر آتا ہے یہ صحیح ہے کہ دکن میں دنیائے آرٹ کی مشہور ترین صنعتیں ایلورا اور اجنٹہ کے غاروں میں موجود ہیں۔ یہاں مسلم فن تعمیر کے صنادید ملتے ہیں۔ دکن کا سنگیت کسی زمانے میں ہندوستان کا متند سنگیت تھا، دکن کی شاعری اپنی ابتدائی ماحول میں ایک آزاد اور مطمئن قلب کی آواز معلوم ہوتی تھی لیکن ان حالات کچھ اور ہیں دکن کے ماضی پر اترا کر حال پر فخر کرنا ایسا ہی ہے جیسے مفلس بیٹا، دولت مند باپ کی جائداد پر اکڑتا ہے۔ دکن میں اس وقت فنون لطیفہ کی کیا حالت ہے، ایک مستقل مضمون کا متحمل ہے، لیکن جس طرح حضرت ظل سبحانی نے مصنوعات ملکی کی نمائش کے آخری دن ارشاد فرمایا، "دکن میں آرٹ کو ابھی ترقی کرنا ہے" ہمارے ماحول میں ابھی آرٹ کی وہ فطری خصوصیات پیدا نہیں ہوئیں جنہیں Aesthetic impulse. یعنی جمالیاتی "حس" کہا جا سکے۔ ہماری ہر چیز میں نقالی نمایش، اور شہرت پسندی کا جذبہ کارفرما ہے، ہمارا ادب، اس وقت مستعار خیالات، اور سطحی جمع و خرچ کا ایک گورکھ دھندا بنا ہوا ہے۔ ایسے ماحول میں سراکبر کا جذبہ آرٹ پرستی کس طرح مطمئن ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دکن میں آرٹ کی ترقی سے متعلق تدبیریں اختیار کرنے میں، سراکبر کی نظر بار بار سارے ہندوستان کے آرٹ پر پڑتی ہے۔ وہ نہ صرف اپنے

شاہ ذیجاہ کے ساتھ ٹیگور آرٹ کی سرپرستی کرتے ہیں، بلکہ خانگی طور پر اعلےٰ درجے کی تصاویر اپنے یہاں جمع کرنے، اور دُنیا کے مختلف عجائب خانوں کو عطا کرنے کی تکلیف گوارا کرتے ہیں۔ سر اکبر کا یہ عمل، کوئی نمائشی عمل نہیں، بلکہ اُن کا قلبی اقتضا تھا۔ اس کا ایک ثبوت اُن کے ایک خیال سے ملتا ہے جو انھوں نے جامعہ پنجاب کے خطبۂ تقسیم اسناد میں فنون لطیفہ کے متعلق ظاہر کیا تھا۔

"خط و خال کی دلفریبی کا ملکہ ہندوستانی طلبہ میں پوشیدہ ہے اور یہی وہ عطیہ ہے جن سے اجنٹہ کی دیواری نقاشیاں ظہور میں آئی ہیں"

آگے لکھا ہے:-

"ہندوستان میں بدھ مت کے مفقود ہونے کے ساتھ ہی یہ فن بھی مٹ گیا۔ یہ معلوم کرنا کس قدر ضروری ہے کہ وہ کیا سماجی، سیاسی اور تعلیمی حالات تھے جنھوں نے ان گراں بہا عطیات کے عملی اظہار کو یک لخت روک دیا"

ان مسائل پر ایسے ہی شخص کی نظر پڑ سکتی ہے جو آرٹ کے ساتھ دلی لگاؤ رکھتا ہو۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ آرٹ ایک ذہنی عشرت اور تفریح ہے۔ اس مسئلہ کو فلسفیانہ گہرائیوں کے ساتھ پیش کرنے میں جرمن مفکر شیلر اور انگریزی ماہر نفسیات ہربرٹ اسپنسر نے نمایاں حصہ لیا۔ اس کی اعلےٰ ترین وضاحت اڈنڈ گروز نے کی۔ لیکن ان مفکرین کا مشاسطی طور پر یہ ثابت کرنا نہ تھا کہ آرٹ عملی زندگی میں عشرت اور تفریح سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ اُن کا منشا یہ بتانا تھا کہ آرٹ کا جذبہ جو تلاش حسن کا جذبہ ہے، جس میں روح انسانی دنیاوی کثافتوں اور مادی زنجیروں کو توڑ کر ایسے عالم میں پہنچتی ہے جہاں وہ مسرت، کیف، اور آزادی محسوس کرے، جہاں انسان وارفتہ حیوانوں سے بھی زیادہ Self expression. کی بے اختیار تڑپ لیکر پیدا ہوتا ہے، جہاں انسان کے اندر دو دنیائیں نظر آتی ہیں، اور آرٹ روح اور مادے کی سرحدوں کو ایک دوسرے سے ملاتا ہے۔ انسانیت کے اعلےٰ ترین مدارج طے کرنا کا جذبہ یہی ہے۔ اسی ترنگ میں نطشے نے یہ تک کہہ دیا کہ مافوق انسان کی تخلیق، آرٹ کے اعلےٰ ترین جذبات بلکہ جنون کے ذریعے ہوتی ہے۔ خوش حال اور خوش اثر اشخاص سے آرٹ جب متعلق کیا جاتا ہے تو یہ سمجھا جاتا

ہے کہ آرٹ کے ساتھ اُن کی دلچسپی محض اُن کے اوقاتِ فرصت کے بہلانے اور صرف کرنے کا مشغلہ ہے لیکن سراکبر کا یہ مشغلہ اتنا سرسری نہ تھا، وہ یہ جانتے تھے کہ آرٹ اگر طرف انسان کو (Self expression.) سکھاتا ہے تو دوسری طرف اس کے اندر (Social instinct) کو اتنا بیدار کرتا ہے کہ وہ بہ حیثیت فرد اور بہ حیثیت جماعت اپنے آپ کو کامل حیاتِ انسانی کی شان اور حسن کا ایک جزو سمجھنے لگتا ہے۔ سراکبر میں زندگی کے اس اجتماعی عنصر کا خیال اتنا روشن تھا اور ان کے اندر شاید آرٹسٹ اس طرح بول رہا تھا کہ وہ سیاسی معاملات میں بھی قوموں کو نسل، مذہب، تہذیب اور تمدن کے الگ الگ خانوں میں کھڑے ہوئے نہ دیکھ سکے۔ انھوں نے آرٹسٹ ہی کی نظر سے دیکھا کہ ہندوستانی جامعات میں تخلیقی کام کی بہت کمی ہے اور کہا:۔

"ہندوستانی جامعات کا کام جو اولاً بیشتر تجدیدی ہوگا ۔ یعنی جو کام کی باتیں ملک میں پہلے تھیں، لیکن اب تباہ نا پید ہوگئی ہیں، اُن کو پھر زندہ کرنا ۔ یہ تجدیدی کام، ساتھ ہی ساتھ، بہترین اور اعلےٰ ترین معنوں میں تخلیقی کام ثابت ہوگا۔ اس لئے کہ اس کی بنیاد جوش انگیز داستانِ ماضی اور اس کی منزلِ مقصود قابلِ ناز اور قومی قوت کا منتقل ہوگی ہندوستان اب کسی عہدِ پارینہ کے اعادے کی طرف لوٹ نہیں سکتا۔"

عام طور پر تقریر و تحریر میں تخلیقی عمل کی طرف توجہ دلانا ایسے لوگوں کے لئے فیشن کی سی حیثیت رکھتا ہے جنھیں نمائشی اور مرعوب کن طرز کے مصنوعی خیالات ظاہر کرنے کا شوق ہے۔ لیکن تخلیقی عمل کے وظیفہ خوانوں کو بہت کم علم اس کا ہوتا ہے کہ تخلیقی عمل کہتے کسے ہیں؟ جہاں تک سراکبر کی عملی زندگی اور ان کے تعلیمی خطبوں کا تعلق ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک ماہرِ تعلیم کی حیثیت سے سراکبر یہ جانتے تھے کہ تخلیقی عمل کی رُوح کیا ہے اور اپنے اندر ایک آرٹسٹ کو چھپا رکھے ہوئے، وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ تخلیق سے آرٹ کو کتنا گہرا تعلق ہے؟ ان کی زندگی کے ان دو اہم نظریوں کا نچوڑ اُن کے ایک لافانی کارنامے میں نظر آتا ہے جسے جامعہ عثمانیہ کہتے ہیں۔ جامعہ عثمانیہ کی تاسیس کی رُوح میرے نزدیک سراکبر کا یہی جذبہ ہے کہ دکن میں ایسی نوجوان نسل پیدا کی جائے جس میں قوتِ تخلیق موجود ہو، اور جو آرٹ اور قلبِ انسانی کے ربط کو عمدگی کے ساتھ نمایاں کر دکھائے۔ جامعہ عثمانیہ

کا جو امتیاز میں شروع سے دیکھتا آیا ہوں، وہ یہی ہے کہ اس کے نوجوانوں میں دیگر جامعات کے مقابل تخلیقی جذبہ شدت کے ساتھ موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر میدان عمل میں "عثمانیہ قوم" اپنی جدتیں دکھانے کے لئے پیش پیش نظر آتی ہے۔ اب رہا دوسرا امر کہ "عثمانیہ قوم" میں آرٹسٹک حس تک نظر آتا ہے، ہماری غور اور توجہ کا محتاج ہے۔ میرا اپنا تصور یہ ہے کہ عثمانیہ کے معنے ہی آرٹسٹ کے ہیں، کیونکہ جامعہ عثمانیہ میں تعلیم و تربیت کی خوبی یہی ہے کہ اس کے ہر ایک شعبہ میں حسن پیدا کیا جائے۔ کہیں یہ حُسن علمی تہذیب اور شائستگی کی صورت پیدا کرتا ہے، کہیں یہ "عثمانیہ اسپرٹ" میں نظر آتا ہے کہیں طلبا کی تقریری اور تحریری قوتوں میں نظر آتا رہا کہیں تصنیف و تالیف بنکر ظاہر ہوتا ہے، اور کہیں بین الاقوامی شہرت کے رُوپ میں جلوہ گر ہوتا ہے اگر جامعہ کی اس رُوح کی صحیح تربیت کی گئی تو ہندوستان میں جامعہ عثمانیہ ہی ایک ایسی قوم پیدا کرے گی جس کے خواب سرسیّد دیکھا کرتے تھے، اور جس کی اُمید میں ٹیگور کی ساری زندگی ختم ہوگئی۔ یہ ایک حسن اتفاق تھا کہ اکبر کی اُمیدیں جامعہ عثمانیہ کی تاسیس میں مرتکز ہوئیں، اور اُن کا تجربہ کامیاب ہوا۔

جامعہ عثمانیہ میں آرٹ اور سائنس کے دو شعبے الگ الگ ہیں، لیکن میرا خیال ہے کہ یہ نظری طور پر ہوں تو ہوں، لیکن داخلی حیثیت سے ان دونوں میں ایک ہی رُوح کارفرما ہے اور وہ آرٹ یعنی تخلیق اور حسن آفرینی کی ہے۔ اگر بہ نظر تعمق دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ انسانی انفرادیت اور شخصیت کو اُجاگر کرنے، اور اُسے صحیح معنوں میں تخلیقی بنانے میں آرٹ کو ہر شعبہ علمی پر فوقیت حاصل ہے، بلکہ میرا خیال یہ ہے کہ بغیر آرٹ کے کوئی شخص خلاق بن ہی نہیں سکتا، اور جو شخص قوت تخلیق رکھتا ہے وہ کسی نہ کسی حیثیت سے آرٹسٹ ہی ہوتا ہے یہ میری "واحد نظری" ممکن ہے بعض ایسے اہل رائے کو اپیل نہ کرے جو کے دلدادہ ہیں، لیکن اگر مظاہر کے اندر ڈوبنا بھی کوئی چیز ہے، تو میں کہوں گا کہ میرا نظریہ دور از حقیقت نہیں نظر آئیگا۔

اس سے ایک قدم اور آگے بڑھئے تو معلوم ہوگا کہ دور جدید میں حیات انسانی کی تین خصوصیتیں نظر آتی ہیں۔

(۱) آزاد خیالی (۲) خودی (۳) عقلی تجربہ۔

جملہ علوم عقلی میں ان تین امور کا خاصہ دخل ہے، لیکن جب انسان علوم روحانی کے ذریعے عقل و احساس سے ماورا کی دنیا میں داخل ہوتا ہے تو وہ جدید زندگی کی ان تین خصوصیت کو پابہ زنجیر اور عاجز دیکھتا ہے رُوح کی دنیا میں آزاد خیالی، خودی اور عقلی تجربے کا عمل مفلوج ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جدید انسان جب مذہب، عقیدہ، ایمان، تصوف، اور مابعد الطبیعیاتی مسائل میں داخل ہوتا ہے تو بڑے شکوک اور غلط فہمیوں کا شکار ہو جاتا ہے اب ضرورت اس امر کی ہے کہ ایسا علم پیدا ہو جو عقل و روح کا سنگم ہو اور ایسے انسان پیدا کرے جو عقل و رُوح کی کامل ہم آہنگی رکھتے ہوں۔ جدید زندگی اس قسم کے تجربے کر رہی ہے، اور اس قسم کے انسان کے چند نمونے پیش کر رہی ہے مثلاً اقبال جن کے پیغام میں یہ رُوح موجود ہے، یا نطشے اور شوپنہار، جو ایک طرف علم و حکمت، اور دوسری طرف رُوح کے باہمی ربط کو کامیاب دیکھنا چاہتے ہیں۔ اقبال اور نطشے جدید دور کے انسان کامل کی تلاش میں ہیں۔ شوپنہار انسان کو مادیت سے نجات دلانا چاہتا ہے، اور ایک عالمگیر مشیت کا تابع بنانا چاہتا ہے۔ نطشے اور شوپنہار دونوں نے ایسے علم کی بنیاد، جہاں عقل اور رُوح ہاتھ ملائیں آرٹ میں دیکھتے ہیں اقبال اس امر میں مستقل نہیں معلوم ہوتے۔ ایک طرف وہ ایمان، یقین اور عبادت کو انسانیت کا معراج قرار دے کر، رومی کی طرح ایک ایسا انسان کامل پیدا کرنا چاہتے ہیں جس میں رُوح ہی رُوح ہو، دوسری طرف دور جدید کے اقتضا کے تحت اس میں رُوح کی بیخودی نہیں، بلکہ خودی کا احساس پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اقبال کا فلسفہ خودی مغربی فلسفہ اَنا کی ایک تفکری صورت ہے لیکن عملی طور پر اقبال کے انسان کامل میں بنیادی صداقتوں کے باوجود اس کی تخلیق میں ایک تضاد سا نظر آتا ہے۔ خودی اور بیخودی کا بہ یک وقت انسان میں جمع ہونا مشکل ہے۔

دیکھئے، ایک دور ایسا تھا جب کہ انسان کی عقل اتنی بیدار نہ تھی جتنی کہ اب ہے یہ ایک نفسیاتی مسئلہ ہے کہ جب انسان کی کوئی فطری صلاحیت کمزور ہوتی ہے تو قدرت اس کا توازن کسی دوسری صلاحیت کی ترقی سے کر دیتی ہے۔ عقل کی کمزوریوں نے انسان کو رُوح کی دُنیا میں ڈھکیل دیا۔ اس ظلمت نے اس نُور کی تلاش کی، رومی کا انسان کامل، اُسی نور کامل کا مظہر ہے، وہ عقل کو بیچارہ سمجھ کر، انتہائی قوت کے ساتھ رُوح کی توانائیوں سے کام لینا چاہتا ہے۔ اسی طرح نہ صرف انسان بلکہ انسانیت کا مزاج بھی ہے۔ تاریخ میں ایسا دور آیا اور گزر چکا ہے جب کہ انسانیت عقلی بیداری سے پوری طرح متمتع نہ تھی، اور رُوح کی دوسری سرحدیں اپنے آپ کو داخل کرنا

چاہتی تھی۔ اس لئے مذہبی تعلیمات کو بہت زیادہ کامیابی ہوئی۔ دور جدید میں انسانیت اور اس کے مزاج نے عقلی قوتوں کو محسوس کر لیا ہے، اور اُس سے بڑے بڑے کام لینے شروع کر دیئے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ جدید انسان یہ بھی محسوس کرنے لگا ہے کہ عقل سے بالاتر قوتیں اور بھی موجود ہیں۔ مثلاً جذبہ، احساس اور رُوح۔ اگر ان سے کام لیا جائے تو انسان بڑی بڑی ارتقائی منزلوں سے گزر سکتا ہے جدید انسانیت ایک ایسے علم اور ایسی قوت عمل کی تلاش میں ہے جہاں جذبہ، احساس اور رُوح کی دنیا، عقل کے ساتھ مل کر کام کر سکے۔ اقبال کو بھی اس کا اعتراف ہے لیکن وہ نطشے اور شوپنہار کی طرح آرٹ کو ایاغ نگم سمجھنے سے انکار کرتے ہیں۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ انھوں نے جذبہ، احساس اور رُوح کے لیئے آرٹ سے زیادہ بلند مقامات، یقین اور عمل کی پختگی کے اعلیٰ تر مظاہر دکھائے لیکن اس علم کا نام نہ رکھ سکے، یا اس کا جلوہ نہ دکھا سکے جہاں عقل اور رُوح دونوں کو کامل تشفی مل سکے۔ ممکن ہے "عشق" اُن کے نزدیک اس علم کا نام ہو، مگر عام انسانوں کے لئے عشق کی بلند منزل تک پہنچنا مشکل ہے

دور جدید میں جذبہ اور احساس اور رُوح کی تشفی اس میں نہیں سمجھی جاتی کہ انسان "ایمان بالغیب" سے کام لے کر عقل کو معزول کر دے، اور ایک عاجز بیچارہ انسان کی طرح عبادت اور ریاضت کی دنیا میں داخل ہو جائے وہ ارتقار اور اس کے اقتضا کی تشفی اس میں دیکھتا ہے کہ حیات انسانی کی تین خصوصیات، آزاد خیالی، خودی اور عقلی تجربہ بھی موجود ہو، اور جذبہ، احساس اور رُوح کی بیداریاں بھی حاصل ہوں۔ میں خاص طبائع کے لئے مذہبی رجحانات کو ضروری خیال کرتے ہوئے بھی اس امر سے متفق ہوں کہ جس چیز میں عقل و رُوح، جذبہ، احساس اور تجربہ مشاہدہ اور تصور، ادراک اور تخیل، شعور اور بیخودی کا عملی سنجوگ ہو سکتا ہے وہ آرٹ ہے۔

آرٹ اور زندگی کے اس تعلق میں انسانیت کی بڑی خدمت کرنے والی صلاحیت آرٹسٹ کی قوت تخلیق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے اس صنعتی اور دور میکانی میں آرٹسٹ کی خاص توقیر اور احترام میں کوئی فرق نہیں آیا۔ جہاں دُنیا آن آشٹائن اور ایڈیسن کی قائل ہے، ویلز اور شا کو بھی فراموش نہیں کر سکتی جہاں گاندھی اور جناح کی علمیت کارفرما ہے، وہاں ٹیگور اور اقبال کے نام بھی اس احترام سے لئے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس دور جدید کا تصوری انسان آرٹسٹ میں نظر آتا ہے اور اس کی قوت تخلیق اور انفرادیت اس کے کارناموں کی دوامی قدر و قیمت، اس کی حسن آفرینی، جملہ انسانی اعمال کی محرک ثابت ہوتی اور اُن کی

کامیابیوں کی رُوحِ رواں ثابت ہو کر، اُن کی آخری منزلوں کا حسن دنیا کے سامنے پیش کرتی ہے۔

سر اکبر نے قوت تخلیق کو مستقبل کا معمار قرار دیا۔ انھیں ایلورا اور اجنٹہ کے حسن کارانہ ماضی اور اس پر تحقیق ہندوستانی کی آیندہ تہذیب نظر آئی۔ یہی آرٹسٹ کی رُوح ہے۔ جامعہ عثمانیہ سر اکبر کے تخلیقی تصور اور خواب کی ایک حقیقی تعبیر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں سر اکبر کے حسن کارانہ کارناموں سے زیادہ، آرٹ کے ساتھ اُن کی محبت کو اُن کی زندگی کا ایک حقیقی پہلو سمجھتا ہوں۔

آیئے آرٹ کے ایک اور مسئلے پر غور کریں۔ دور جدید نے سائنس کی ترقی کو شاہراہ بنا دیا ہے اور اس وقت صنعت و حرفت، معاشیات، جیسے فنون کو (Royal road.) شاہراہ پر ڈال دیا ہے۔ اب زندگی کی ہمہ جہتی ترقی میں ان کا اتنا دخل ہے کہ مذہب اور اخلاق میں کمزوریاں پیدا ہو گئی ہیں۔ لیکن یورپ کی جدید سیاست، اور اس کے ایک نتیجے یعنی جنگ نے آیندہ کے غور و فکر کے لئے چند مسائل کے دروازے کھول دئے ہیں ہم میں سائنس سیاست اور صنعت و حرفت کی ترقی سے قطعی بے نیازی اور بے تعلقی کا احساس تو نہیں ہوا ہے لیکن ہم یہ سوچنے لگے ہیں کہ اگر انسان پورے طور پر انھیں کا ہو کر رہ جائے تو اس کی زندگی یقیناً خطرناک منزل کی طرف چلی جائے گی۔ اب ہم یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ انسانی ترقی میں سکون کے پیغام کی ضرورت ہے۔ انسان کے ضمیر اور خیال، اس کے تصور اور ادراک میں ایک تہذیب کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ اس کے اعمال، اور اقوال میں اخلاقیات کا ایک بلند اصول کارفرما ہونا چاہیئے ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے سب سے پہلے جدید انسان کو مادیت کی قوی زنجیروں سے نکل آنا پڑے گا۔ پھر اسے ایسے علم اور پھر عمل کی تلاش کرنی ہوگی جہاں اس کی مادی ترقیوں کو دھکا نہ پہنچے، اور دوسری طرف اس کے قلب و دماغ، اُس کی رُوح اور زندگی کو ان کی محنتوں کا صلہ، سکون، اطمینان، مسرت اور حسن، امن اور اخلاق کی صورت میں حاصل ہو سکے۔ شوپنہار اس نجات کو آرٹ ہی میں دیکھتا ہے۔ ہیگل کائنات کے ارتقائی عمل کی بنیاد تخلیق حسن پر رکھتے ہوئے یہی بتاتا ہے کہ مادے میں تمثال ازل مقید ہے، آرٹ کا کام ہے کہ وہ ذرے کا دل چیر کر پھر سے نور حقیقی کا جلوہ دکھائے۔

ستارہ می شکفند آفتاب می سازند

اگر سر اکبر نے جامعہ عثمانیہ کی تاسیس میں یہ خواب دیکھا تو بہت بلند خواب دیکھا اور اگر جامعہ عثمانیہ نے اس

خواب کو ممنون تعبیر کرنا چاہا تو اس نے اپنے معمار اول کی صحیح ترجمانی کی۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ ہماری قوم، ہمارے ملک اور ہماری تہذیب کے اہم مرکز یعنی جامعہ عثمانیہ میں آرٹ کی صحیح تخلیقی قوتوں کو اجاگر کیا جائے اور اُن کی حفاظت کی جائے۔ اگر ایک جامعہ صرف معلومات کے افسانے ہی پر اپنے عمل کا انحصار رکھے تو ظاہر ہے کہ اس کے علم کا حُسن پوری طرح روشن نہ ہو سکے گا۔ اور اس کے عمل کی مسرت کامل طور پر حاصل نہ ہو سکے گی۔

آرٹ کی پیدائش کا نفسیاتی راز یہ ہے کہ انسان ابتدا سے فطرت زندگی اور ماحول کو ہمیشہ اپنی خواہشات اور تمناؤں کے ہم آہنگ بنانا چاہتا تھا۔ حُسن اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب کہ کوئی شے انسان کی مسرت کا مظہر ہو، اور اس کی چند صفات سے انسان کے جذبات کو تشفی اور تسکین حاصل ہو سکے۔ اسی جذبہ تشفی کے ساتھ انسان نے حقیقت کے تین نام رکھے ہیں۔ ایک حسن، دوسرے حق اور تیسرے خیر۔ حُسن کار حُسن میں حقیقت اور حقیقت میں حسن دیکھتا ہے بسا اوقات ایسا ہوتا ہے جس طرح اسپونزا نے کہا:-

"ہم کسی شے کی اس لئے خواہش نہیں رکھتے کہ وہ خیر ہے بلکہ وہ خیر اس لئے ہوتی ہے کہ ہم اس کی خواہش رکھتے ہیں"

یہی حال کم و بیش سائنداں کا ہے۔ آرٹ اور زندگی میں جو تعلق اور ربط ہے وہ ماحول کے ساتھ اس ہم آہنگی اور مسرت کی وجہ سے ہے انسان طرح طرح سے اس ہم آہنگی اور مسرت کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ سر اکبر میں اپنے ماحول کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے کا ایک حُسن کارانہ جذبہ تھا، جو بسا اوقات حد سے تجاوز کر جاتا تھا۔ وہ ذات پات، نسل، رنگ، قوم اور مذہب کو انسان اور انسانیت کے اعلےٰ جوہروں پر ترجیح نہیں دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ سر اکبر کی یہ کوشش پوری طرح کامیاب نہ ہو سکی۔ انھوں نے اپنی اس تمنا کو آرٹ کی سرپرستی میں پورا کیا۔ فقط

محمد عبدالقیوم خان باقی

ہندو مسلم مسئلہ سراکبر کی نظر میں

سراکبر جس بنا پر نیک نام کہے جاسکتے ہیں یا بعض لوگوں کے نزدیک قابل الزام تو وہ صرف ہندو مسلم مسئلہ ہے کیونکہ یہیں سے سراکبر نے ایک مصلح کی حیثیت سے وہ بنیادی کام شروع کیا جس کے آثار آج بھی سارے ہندوستان اور خصوصاً حیدرآباد میں نمایاں ہیں کسی مصلح کی زندگی کا پہلا باب اسی وقت شروع ہوتا ہے جب اس کی مخالفت شروع ہوتی ہے اور سراکبر کی زندگی کا میری رائے میں پہلا باب اسی جگہ سے شروع ہوا جہاں مسلمانوں نے یہ سمجھا کہ سراکبر مسلم حقوق کے معاملہ میں انصاف پر نہیں اور ہندوؤں نے یہ سمجھا کہ ان کا حق دینے میں سراکبر کی اسکیمیں فراخ نہیں ہوتیں یہ اُن کی زندگی سے متعلق مختلف تصورات ہیں لیکن یقیناً سراکبر کی خوش قسمتی ہے کہ ان کے لئے دونوں طبقوں میں یہ رائے ظاہر کی گئی کیونکہ جب اصلاح شروع ہوتی ہے تو اسی طرح جس طرح دو ڈالیوں کے ملانے کے لئے دونوں ڈالیوں کو قلم کیا جاتا ہے۔ دو تصورات کو یکجا کرنے کے مقصد سے دونوں میں بنیادی تغیر کی ضرورت لاحق ہوتی ہے سراکبر نے یہی کیا اور انھیں یہی کرنا بھی چاہیئے تھا۔

ان کی زندگی سے اس اہم ترین مسئلہ پر جو کچھ مواد ہمیں حاصل ہوسکا اس کی روشنی میں ہم مشتے نمونہ از خروارے کی مثال چند باتیں پیش کرتے ہیں ظاہر ہے کہ سراکبر سے قریب تر رہنے والوں یا ان کی نکتہ بینی تک رسائی رکھنے والوں کی نظر میں اس سے بہتر بھی بہت سی باتیں ہوں گی۔ کسی کے دنیا سے گزر جانے کے بعد ہی اس سے متعلق وہ صحیح آراء ظاہر ہوتی ہیں جو مختلف اثرات کی بنا پر اس کی زندگی میں کسی نہ کسی رنگ میں چھپی ہوئی ہوتی ہیں اس لئے سراکبر کی مخالفت یا موافقت دونوں پہلوؤں کا صحیح اندازہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب کہ وہ ہم میں نہیں ہیں اور ہماری قوم کو ایک نقصان کا احساس ہے جس طرح ہمیشہ قدر نعمت بعد از زوال کا اثر ہوتا ہے۔

۱۹۲۵ء میں آج کے سیاست داں اور مصلح اپنی زندگی کی ابجدی منازل طے کر رہے تھے اور سر اکبر نے اپنی دور بینی کی بنا پر وہ پختہ عقیدہ پیدا کر لیا تھا جو مرتے دم تک ان کا نصب العین رہا انھوں نے یہ یقین کر لیا تھا کہ ہندو اور مسلمان ہندوستان کی موجودہ دنیا میں اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتے جب تک کہ دونوں بجائے ساہوکارانہ لین دین کے فیاضی پر آمادہ نہ ہو جائیں اور اپنی تمدنی، اخلاقی، سماجی اور سیاسی روایات میں ان مشترکہ عناصر کی حفاظت نہ کر لیں جو ہندو مسلم اتحاد کا سرچشمہ ہے۔

جسٹس رانا ڈے آنجہانی کے مشورے اور امداد سے مسٹر سی وائی چنتامنی نے ہندوستان کی اصلاح معاشرت پر ایک مجموعہ مضامین شائع کیا تھا جس میں چودہ مقالات شامل ہیں ان میں سے سر اکبر کا مقالہ ہندو مسلم تعلقات کے موضوع پر تھا سر اکبر نے ہندوستان کی حالت پر ایک درد بھرے دل کی طرح اس مضمون میں صاف صاف کہہ دیا ہے۔

"نفس اصلاح کا تقاضا ہی کثرت میں وحدت چاہتا ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ آپس میں اتفاق اور یکجہتی ہو یعنی منفرد اور مختلف الاجزاء وحدتوں کو سمو کر ایک ایسے متحد المجنس مجموعہ کی شکل میں ترتیب دینا جو اپنے ماحول کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہو۔ یہ ماحول اگر چہ گھر کی چار دیواری سے شروع ہوتا ہے لیکن وہیں تک محدود نہیں رہتا بلکہ عمل، ملت اور وطن کے تعلقات کو سمیٹتا ہوا وسیع سے وسیع تر ہو جاتا ہے۔ اس اعتبار سے صلح معاشرت کا دائرہ عمل پیغمبر کی صدا عمل کے ہمکنار ہو جاتا ہے جو دنیا وی آسودگی اور کل بنی نوع انسان کے ساتھ حسن سلوک کی منادی کرتا ہے ..... ہندوستانی مصلحان معاشرت کے نظام العمل کے مختلف اجزاء" سیاسی شورش پسندوں" (اس لفظ سے تنقیص مدنظر نہیں) کے مزعومہ مطالبات وحقوق، یعنی صوفی جد وجہد کی ساری شگوفہ کاریوں (یعنی صوفی کا وسیع ترین مفہوم) ان سب کی کل اہمیت اور ان کا تمام تر جواز صرف اسی قدر ہے کہ یہ گویا قدم ہیں جو اگر چہ اکثر رک رک کر عموماً غیر ارادی طور پر اٹھتے ہیں۔ لیکن ہیں بتدریج اس منزل مقصود کے قریب کرتے رہتے ہیں جو اگر چہ بہت دور ہے لیکن جہاں پہنچ کر ہم عورتیں اور مرد سب خود دار بن جائیں گے"

"ہم اور اہل ہنود ایک ہی رشتۂ وحدت میں منسلک ہیں اور ہمیں اپنی فلاح وبہبود کے لئے مل جل کر جد وجہد کرنا ہے اس وقت تک سیاسی اصلاحات کی ہماری ہر کوشش بے کار اور ہر سعی فیر مشکور ثابت ہوگی"

اس صاف گوئی کو آج کے حالات پر منطبق کرکے دیکھئے کہ سیاست دیوار زنداں میں بند ہو کر یہی نعرہ لگا رہی ہے کہ کاش اتحاد ہوتا اور ہم سب مرد اور عورتیں خود دار بن جاتے خود داری کا یہی تصور جو سراکبر نے پیش فرمایا ہماری ہندوستانی زندگی کا وہ بیش قیمت سرمایہ ہے جس کو ہندوستان کے تمام مصلحان معاشرت نے اولیت کا درجہ دیا ہے۔ اور آج کا تجربہ ہے کہ ہر اصلاحی منزل پر کہا جاتا ہے کہ تم دونوں مل کر آؤ اور اپنا اپنا نہیں ملک کا مشترکہ سرمایہ لے جاؤ۔

ان حالات میں جب ہم غور کرتے ہیں تو چاروں طرف سے اتحاد اتحاد کے شور و پکار میں سب مصلحوں نے اتحاد کی جو بنیادیں تبلائی ہیں اُن بنیادوں میں کونسی ایسی بنیاد ہے جس کو کسی مصلح نے عملاً نافذ کر دیا تو معلوم ہوتا ہے کہ مساویانہ اختیار کی بنا وہ بنیاد تھی جس کو سراکبر نے قائم کیا اور وہی اب تک صرف سراکبر کے نظریہ کی حیثیت سے زندہ ہے۔

اس بنیاد پر بحث کرتے ہوئے سراکبر نے تاریخی، سماجی اور ذہنی عوامل سے بحث کی ہے وہ اسی مقالہ میں جس کا اقتباس میں نے ابھی پیش کیا ہے ایک جگہ یہ کہتے ہیں کہ ہندو مسلم اتحاد کی راہ میں بہت سی چیزیں حائل بتلائی جاتی ہیں جن میں سے ایک برطانوی اقتدار بھی ہے جس پر مفکرین نے دونوں پہلو پیش کئے ہیں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہی دور مرتب کرنے والے عوامل کو یکجا کر رہا ہے اور یہ بھی رائے ظاہر کی گئی ہے کہ اختلاف کے نئے اجزا اسی دور میں پیدا ہوئے اب سراکبر کی زبان سے سنئے:۔

ہندوستان کی ترقی کے عناصر کو گنواتے ہوئے سراکبر کہتے ہیں:۔

"وحدت اور ہم آہنگی کی وہ زبردست قوتیں جن کا میں نے ذکر کیا ہے برطانوی اقتدار ہی کی رہین منت ہیں بلکہ ان کا تصور ان کے حصول کا امکان بھی اسی اقتدار کی وجہ سے پیدا ہوا ہے یہ قوتیں کیا ہیں متحدہ امن عامہ ساوی قوانین، غیر جانبدارانہ عدالت، بعد مکانی مٹانے والی ریلیں، وقت کو مختصر کرنے والی تار برقی اور ان سب سے بھی بڑھ کر اخلاق آفریں اور ولولہ خیز ادبیات جس نے اکابر عالم کے افعال و اقوال اور حالات کے دروازے ہم پر کھول دیئے ہیں"

اسی کے برعکس جو رائے ہے اس پر روشنی ڈالتے ہوئے سراکبر کہتے ہیں:۔

"یہ معمہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ گویا اسی برطانوی اقتدار کی وجہ سے ہندوستان کی دو بڑی قوموں میں اختلاف باہمی کے کچھ نئے اجزا بھی پیدا ہو گئے ہیں یعنی ایسے اجزا جو فی نفسہ اہمیت سے خالی ہیں لیکن ان کا اثر بہت زیادہ لیا جا رہا ہے ایک طرف تو تعلیم کو حصول ملازمت کا واحد معیار نہیں تو بھی خاص معیار بنا دینے سے ہندوؤں کو اس اثر و اقتدار کے حاصل کرنے میں جو پہلے انھیں سوائے مغربی ہندوستان کے اور کہیں حاصل نہ تھا فائدہ پہنچا ہے اور اسلامی مفتوحات ہندوستان کے ان تعصب آمیز اور رائج الوقت بیانات کو پڑھ کر جنھیں بدقسمتی سے تاریخ کا نام دیا جاتا ہے ہندوؤں کی نئی نسلوں میں یہ جذبہ پیدا ہو گیا ہے کہ اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر وہ پرانے بدلے لے جائیں (صاف بیانی معاف ہو) جو ان کی رائے میں محمود غزنوی کے زمانہ سے لیکر اورنگ زیب اور ٹیپو سلطان کے زمانہ تک باقی ہیں۔ دوسری طرف مسلمانوں میں جو اپنی آنکھوں کے سامنے اثر و اقتدار کو مٹتے ہوئے دیکھ رہے ہیں وہ بیزاری جو پہلے انگریزوں کے ساتھ تھی اب ہندوؤں کے ساتھ ہوتی جا رہی ہے ..... ایک طرف تو اسلامی عہد حکومت ..... کی "تلخ" یاد اور اس سے پیدا ہونے والا جذبہ انتقام اور دوسری طرف مسلمانوں کا برابر سرکاری ملازمتوں سے محروم ہوتے جانا ..... یہ دو اجزا باہمی نفاق کے خاص اشخاص اسباب ہیں اور اس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ جن علاقوں میں اسلامی اثر کم پائدار ہے یا جہاں کاروبار تجارت جس سے سرکاری ملازمت کے مقابلہ کی تیزی کم ہو جاتی ہے سب سے زیادہ بڑھا ہے وہاں دونوں قوموں کے تعلقات سب علاقوں سے زیادہ خوشگوار ہیں۔"

سر اکبر نے جہاں یہ بتلا دیا ہے کہ سماجی زندگی میں اتحاد کے کونسے عوامل موجود ہیں وہاں اختلافات سے بھی بحث کی ہے اور ہم نے ان اقتباسات کو اوپر پیش کر دیا ہے جن کے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ سر اکبر نے ہندوستان کے ماہرین معاشیات کے نقطۂ نظر کی صحیح ترجمانی کی ہے اور بتلایا ہے کہ ہندو مسلم اتحاد آسودگی کے دور کا ثمر تھا اور معاشی تنگ حالی اور اقتدار سے محرومی کے دور میں پیٹ کی کشمکش نے مخالفت کے عناصر بیدار کئے گویا برطانوی اقتدار ہو یا اہل ہند کی محرومی کسی طرح بھی کہا جائے صرف یہی ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو ملک کی معاشی دولت میں جو حصہ ہندوستان کی کاملیت نے دیا تھا وہ اب قاسم کے بدل جانے کی وجہ نفاق کی بنیاد بن گیا ہے۔

اس تصور کو سامنے رکھتے ہوئے غور کیجئے تاکہ سر اکبر نے جس اصلاح کا قدم اٹھایا تو اس بنیادی تصور کو بھی کس طرح سامنے رکھا۔ اور حیدرآباد میں اس کی کتنی بنیادی مثالیں موجود ہیں۔

میں نے اس وقت تک سر اکبر کے تصور سے دو نکات پیش کئے ہیں۔ ایک وجہ اختلاف اور دوسرے اس کا حل۔ لیجئے مساویانہ ایثار! اس روشنی میں سر اکبر کی زندگی سے اور بھی چیزیں چن کر نکالئے تو معلوم ہوگا کہ انہوں نے کتنے ہی اور حل پیش کئے ہیں جن کی اساس پر ہندو مسلم مسئلہ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے حل ہوسکتا ہے اور وہ خودداری حاصل کی جاسکتی ہے جو سر اکبر چاہتے تھے کہ ہندوستانیوں کو حاصل ہو جائے۔ یہاں ذہنی اصلاح کی طرف سر اکبر نے جس انداز سے فکری رسائی حاصل کی ہے اس کے چند اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں اسی خطبہ میں جس کے اقتباسات اس سے پہلے پیش کئے گئے۔ سر اکبر نے پانچ طریقہ پیش کئے ہیں جن کی اہمیت خود ان جملوں سے ظاہر ہوگی جو نقل کئے جا رہے ہیں:۔

(۱) سب سے پہلا عامل مملکتی پریس ہے۔ اسے اس امر کا حقیقی احساس ہونا چاہئے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں باہمی خوشگوار تعلقات کا ہونا بدرجۂ اتم ضروری ہے۔ آج کل تو ایک دوسرے کے مطالبات پر تلخی اور بے باکی کے ساتھ نکتہ چینی کا رجحان بڑھا ہوا ہے۔ خاص طور پر یہ سلوک ہندو پریس کی جانب سے مسلمانوں کے مطالبات کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ مبالغہ آمیز مطالبات اگر ہوں بھی تو تحمل اور ہمدردی سے کام لیکر مبالغہ آمیزی اور بے باکی کی نرمی کے ساتھ اصلاح کرکے ان کو زیادہ واجبی اور کم تشدد آمیز پیرایہ میں پیش کرنے کے طریقے بتائے جائیں۔ مثلاً مسلمانوں کا مطالبہ یہ ہے کہ اعلیٰ ترین ملازمتوں میں ان کی نمایندگی زیادہ ہونی چاہئے اب یہ صریحی بے انصافی کی بات ہے کہ کسی ایک اسلامی انجمن کے مطالبہ کو یہ کہکر اچھالا جائے کہ مسلمان یہ چاہتے ہیں کہ وہ اعلیٰ ملازمت کا معیار ان کے لئے گھٹا دیا جائے اور اس چیز کو نہ دیکھا جائے کہ اسلامی انجمن کا مطالبہ صرف اس قدر ہے کہ براہ راست اور باقاعدہ طور پر ایک مخصوص تعداد میں ایسے مسلمان "تعلیم یافتوں" کو ملازمتیں دی جائیں جن کے پاس "اسناد ہوں یا" ایسے افسران سررشتہ کی جن کی ماتحتی میں انہوں نے کام سیکھا ہے۔ باقاعدہ تصدیق اور سندیں ہوں۔

اس اقتباس کو دیکھنے سے یہ واضح ہوگا کہ سر اکبر نے ذہنیت کو مسموم کرنے والے عناصر میں سے کتنی صحیح تلاش کے ساتھ اس ایک عامل کو پیش کیا ہے۔ جو دنیا کی سیاسی اصلاح میں چوتھی قوت (Fourth power.)

کہا جاتا ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات کو موجودہ دور میں کشیدہ بنانے والے عوامل میں یہ عامل سب سے زیادہ نمایاں رہا ہے کیونکہ ایک عامی تک ہر مقرر اور ہر مصلح اتنی آسانی سے رسائی حاصل نہیں کرتا جتنی آسانی سے کہ ایک اخبار، جریدہ یا رسالہ پہنچ جاتا ہے۔ آج کل جن ذرائع سے فرقہ وارانہ اختلاف کو اچھالا جاتا ہے۔ ان میں مخصوص پمفلٹوں سے زیادہ اخبار ہی کا استعمال ہوتا ہے ایسی صورت میں اگر اخبارات ملک کے عظیم تر مفاد کے پیش نظر ۱۹۲۵ء سے جبکہ سر اکبر نے یہ رائے ظاہر کی تھی آج تک اس اصول پر عمل کرتے تو فرقہ وارانہ اختلاف اتنی شدت اختیار نہ کرتا جتنی کہ آج حاصل کر چکا ہے۔ اسی اصول کی توضیح کرتے ہوئے سر اکبر نے بتلایا ہے کہ:۔

"یہی اصول ہر ملک کے ہر اخبار کے وہ سرکاری ہو یا غیر سرکاری پیش نظر رہنا چاہیئے۔ اسے ہر مفاد کی پوری نگہداشت کرنی چاہیئے۔ اسے یاد رکھنا چاہیئے کہ خواہ دفتر ہو یا کوئی ادارۂ اتحاد قلبی کے لئے جس کا میں خواستگار ہوں اس کو فعل انتشار یا مرکز استحکام بنانا اس کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ ایک کی حق تلفی یا ایک کی امداد اس مقصد نیک کو برباد کرنے یا ترقی دینے میں متعدد تقریروں یا مقابلوں سے زیادہ موثر ہو سکتی ہے"

یہاں غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ معاشی بنیاد جو اختلاف کا ایک زمانہ سے باعث رہی ہے سر اکبر نے اس طرح صلح کل طریقہ پر پیش کی ہے کہ وہ اثر جو کسی بڑے کا اپنے ماتحت پر ہوتا ہے قدرتی طور پر اتحاد و اتفاق کے لئے استعمال کر لیا جائے۔ یہ روزمرہ کا تجربہ ہے کہ ہر قسم کار رجحان آدمی ہمیشہ اس شخص کی پیروی میں پیدا کرتا ہے جو اس کی نظر میں اس سے برتر ہو۔ اگر اعلیٰ حیثیت رکھنے والا طبقہ خواہ وہ دفتر میں ہو یا سماج میں کسی اور مقام بلند پر اس اصول کو پیش نظر رکھے تو کوئی معنی نہیں کہ کوئی طبقہ یا فرقہ بجز معیار کارکردگی کے کسی اور پیمانہ کو وجہ ترجیح تصور کرے۔ کامل ایمانداری کے ساتھ یہ اصول اگر پیش نظر رہے تو جانبداریاں، سفارشیں، ناجائز استحصال غرض ہر اس خرابی کا خاتمہ ہو سکتا ہے جس کی اصلاح کے لئے کتنی ہی کمیٹیاں مقرر ہوتی ہیں۔ کتنے ہی مطالبات پیش ہوتے ہیں اور ان سب سے اب تک کچھ نہ ہو سکا۔

سر اکبر نے ذہنی اصلاح کی ایک اور منزل بڑی دور بینی کے ساتھ پیش کی ہے وہ ادبیات اور تعلیمی اداروں کے ذریعہ اصلاحی رجحان ہے وہ فرماتے ہیں:۔

"سب سے زیادہ نتیجہ خیز عامل ادبیات ہے۔ آج کل ہندوؤں کی اکثر تصانیف میں ہر قسم کی مذہبی بے حرمتی، بدعملی

اور برائی کا اتہام مسلمانوں پر رکھا جاتا ہے۔ اس بارے میں اس سے بڑھکر اور کوئی کام نہیں ہوسکتا کہ اپنے سب سے بڑے مفکر کے . . . . . .

مختلف پہلوؤں پر یکے بعد دیگرے اس قدر بصیرت افروز روشنی ڈالتے ہیں کہ جامعہ لکھنو کے خطبہ کو پیش نظر رکھکر تحقیقات کے جو خطوط اسلوب اس میں بتائے گئے ہیں۔ ان پر مزید کام کریں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تاریخ ہند پر ایسی مناسب کتابیں تیار ہو جائیں گی جن میں اسلامی فتوحات ہند پر ہمدردانہ بحث ہو اور مسلمانوں نے ہندی تہذیب کے فروغ میں جو حصہ لیا ہے وہ ظاہر ہو اور اس طرح دونوں قوموں کی باہمی کدورت کا سبب جس کا پہلے ذکر کیا گیا ہے۔ مٹ جائے گا۔"

جامعہ لکھنو کے جس خطبہ کا سر اکبر نے ذکر کیا ہے وہ سر اکبر کے اس مقالہ سے کچھ پہلے کا ہے جس میں تاریخ کی جدید تحقیقات اور ہندو مسلم اتحاد کے پیش نظر نئے نصاب تعلیم کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور تبلایا گیا ہے کہ موخرین کی جانبدارانہ رائے کو کس طرح مختلف آرا جمع کرکے ایک صحیح نتیجہ اخذ کرتے ہوئے نرم اور دونوں اقوام کے لئے باہمی محبت و مودت کے بندھنوں کو استوار کرنے والا بنایا جاسکتا ہے۔ جامعہ پنجاب کے خطبۂ تقسیم اسناد میں سر اکبر نے تاریخ کے مسئلہ پر جامعات کے فرائض واضح کرتے ہوئے اس نکتہ کو نہایت صحیح روشنی میں پیش فرمایا ہے۔ سر اکبر کہتے ہیں :-

" ہماری تاریخ کے اصلی ماخذوں کا باقاعدہ تحقیقی کام ہاتھ میں لینا ضروری ہے۔ ان ماخذوں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے اور ان میں سے بعض کی صحیح تعبیر اور مضمون کا تعین صرف ہندوستانی ہی کرسکتے ہیں . . . . موجودہ درسی کتابوں میں ہندوستانی تاریخ کے مختلف زبانوں اور ان کے امتیازات کے بارے میں جو باتیں پائی جاتی ہیں ان کی نظر ثانی کرنی پڑے گی۔ تاریخی درسی کتابوں سے تاریخ ہند کے متعلق ہمارے طلبا نفسی نقوش حاصل کرتے ہیں اور یہ نقوش اس لئے بہت گہرے ہوتے ہیں کہ یہ نفسی نمو کے ابتدائی زمانہ میں دل و دماغ پر مرتسم ہوجاتے ہیں۔ مثلاً یہ بات صحت کے ساتھ دریافت ہوتی ہے کہ بدھ مت کا جس زمانہ میں ہندوستان میں راج تھا دوسرے مذاہب کے ساتھ اس کے کیا تعلقات تھے بدھ مت کے عروج کے کیا اسباب تھے۔ اور وہ کونسی قوتیں تھیں جو اس کے زوال کا باعث ہوئیں۔ کیا بدھ مت نے اپنی تاریخ کے کسی حصہ میں اور مذہب والوں کے ساتھ جبر و تشدد کا برتاؤ کیا جسکی بعد میں خود اس کو سختیاں جھیلنی پڑیں؟

یہ بھی تحقیق طلب ہے کہ آیا مدت ہندوئیت کے منجملہ اور فرقوں کے ایک فرقہ کی حیثیت رکھتا تھا جو پھیلتا گیا اور لوگوں نے اس سے فیاضانہ رواداری برتی - اچھا اب بعد کے ایک تاریخی زمانہ کو لیجئے اس میں یہ امر معلوم کرنا ہے کہ مرہٹوں، افغانیوں اور مغلوں کے حملے، مذہبی جوش و خروش کا محل تھے یا ان کی تہ میں محض معاشی اسباب تھے جن پر بعد کے مورخوں نے یا خود حملہ آوروں نے ملک گیری کے جنون کو ڈھانکنے کی غرض سے مذہبی رنگ چڑھا دیا۔ یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ اورنگ زیب اور ٹیپو سلطان جیسے فرمانروا آیا محض تعصب میں ڈوبے ہوئے تھے یا یہ کہ سیاسی مقاصد ہی ان کے کاموں کے محرک تھے - یہ سوال ان تاریخی دستاویزوں کی بنیاد پر ہونا ہے جو اب ہاتھ لگی ہیں اور شائع کی گئی ہیں مثلاً ایک عالمگیری فرمان میں بنارس کے مسلمان صوبہ دار کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے صوبوں میں ہندو مندروں کے اوقاف کی احترام اور احتیاط کے ساتھ نگہداشت کرے - اور اس بات کا خیال رکھے کہ ہندو رعایا پوری آزادی کے ساتھ اپنے مذہبی رسوم ادا کرتی رہے - دوسری دستاویز میں ٹیپو سلطان کے احکام ہیں - ٹیپو سلطان کے والد کی نسبت یہ بات مشہور ہے کہ انہوں نے اپنے ہندو آقاؤں کے ساتھ ہمیشہ احترام اور وفاداری کو ملحوظ رکھا ٹیپو سلطان کے احکام یہ ہیں کہ برہمن پجاریوں کو دل کھول کر روپیہ دیا جائے اور ان سے استدعا کی جائے کہ وہ دشمنوں پر ٹیپو سلطان کی فتح یابی کے لئے دعا کریں - اب جو تاریخیں مدرج ہیں ان میں جنوبی ہند میں تاریخ ہند کے دلچسپ فسانۂ ہندی کلچر اور ہندو مسلم اتحاد میں جو اضافہ کیا ہے اس کا ذکر کافی طور پر نہیں ہے بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ دکن کے مشہور وزیر محمود گاواں نے کامیابی کے ساتھ عامۃ الناس کی تعلیم کا انتظام کیا - ملک عنبر ایک سپاہی اور مدبر تھا - نظام شاہی عہد میں اس نے انگڑائی میں جو جو اصلاحیں کیں ان سے بھی شاذ و نادر ہی لوگ واقف ہیں - حالانکہ ملک عنبر کے نام کی اس طرح شہرت ہونی چاہئے جیسی کہ ٹوڈرمل کی ہے گنتی کے ہندوستانی ایسے ہیں جو وجیانگر کی ہندو قطب شاہی اور عادل شاہی سلطنتوں کی تاریخ سے واقف ہیں - ان سلطنتوں نے ہندو عناصر کو کیمیاوی ترکیب دی اور اس شیرازہ بندی سے ایک خیالات سے مالا مال ادب، شاندار عمارات، خیر گستر سیاسی ڈھانچہ اور روادار نظم و نسق پیدا کیا اور آج کل بھی ان چیزوں کے آثار دکن میں پائے جاتے ہیں۔"

اس مبسوط بحث کو اتنی طوالت کے ساتھ پیش کرنے کی محض وجہ یہ ہے کہ سر اکبر نے جن کی ہر حتی معلومات اس قدر وسیع تھیں بعض دل ٹوٹنے والی باتیں کہی ہیں اور یہ بتلایا ہے کہ کس طرح بچپن سے ذہنیت مسموم ہوتی ہے

جس کا ردِ عمل بعد کی عمر میں نوجوانوں پر بڑا گہرا ہوتا ہے اور آیندہ آنے والی قوم اور نسل ان اثرات کو پرورش کرتے ہوئے ایک ایسی راہ پر چلتی ہے جہاں اتحاد اور رواداری ایک فطری رجحان کے طور پر نہیں ملسکتی۔ اگر سر اکبر نے جس قسم کی تاریخ کی طرف جامعہ لکھنؤ کے خطبہ کے حوالہ سے بحث کی ہے۔ اور اپنے خطبۂ تقسیم اسناد جامعہ پنجاب میں عملی مثالیں پیش کی ہیں۔ اس تاریخ کی طرف اس زمانہ میں توجہ ہوتی تو شائد اب تک طالب علموں میں کم از کم اس قسم کی ضرورت نہ ہوتی بلکہ وہ ایک ایسی قوم بنتے جس کے لئے کاملیت کاملیت کی پکار کی ضرورت نہیں ہوتی اور صحیح معنی میں ہندوستان اپنا وہ قومی وقار حاصل کرلیتا جس کا وہ مستحق ہے۔

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں بھی سر اکبر نے اس مسئلہ پر بحث کی ہے۔ انہوں نے بنگالی زبان کے مسلم ادب ہندوستان کے مسلم دور پر روشنی ڈالتے ہوئے بتلایا ہے کہ کس طرح سے ہماری تاریخ ذہنوں کو مسموم کرتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے چند اشعار پیش کئے ہیں:۔

کبھی کرتے تھے ہم بھی حکمرانی ان ممالک پر
مگر وہ حکمرانی جس کا سکہ جان و دل پر تھا
نہیں لے دے کے بس اس داستاں کی یاد اتنی
کہ عالمگیر ہندو کش تھا ظالم تھا ستمگر تھا

کتنے تلخ پیرایہ میں اس شاعر نے تاریخ پر قلم اٹھایا ہے۔ شائد یہ قوم کے جذبۂ اتحاد کی دلیل ہو کہ ایسی چیزیں اب پسند نہیں کی جارہی ہیں جن میں اس قسم کے واقعات ہوں جن کی طرف شاعر نے اشارہ کیا ہے اور سر اکبر کو یہی بات پسند آئی کہ انہوں نے یہ سوال پیش کئے۔

ادبیات کے بعد سر اکبر نے فنون لطیفہ پر زور دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ فنون لطیفہ کو نئے زاویۂ نگاہ سے ہندوستان میں ترقی دینے کی ضرورت ہے تاکہ ہم اصلی ہندی قومیت میں اپنے مخصوص تمدنوں کے نمونے پیش کرسکیں اور ہند کی قومی مجلس میں اپنی اپنی خوبیوں سے ایک دوسرے کی کوتاہیوں کی تلافی کریں جس طرح اسلامی تمدن نے مختلف صورتوں میں ہندوستان پر اثر ڈالا ہے اور ہندوستان کے تمدن کا اثر مسلمانوں پر ہوا۔ اسی طرح ہم ہندو ہوں یا بدھ، ایرانی ہوں یا مسلمان یا عیسائی اپنی خصوصیات سے جو اب تک ہم میں باقی ہیں ایک دوسرے پر پسندیدہ

اثر ڈالتے رہیں گے۔ ہندوستان ایک ملک اور ایک قوم ہوگا۔ ہندوستان اور اس کی قومیت کے لئے وہ دن نہایت منحوس ہوگا۔ اگر مسلمان اجنٹہ کی حیرت انگیز اور لازوال نقاشی یا الورہ کی عجیب و غریب سنگ تراشی کے نمونے دیکھیں اور عش عش نہ کرنے لگیں یا وہ جیادیو کے من موہن گیت یا بھگوت گیتا میں سری کرشن کا پرمعنی و لطیف کلام پڑھیں اور وجد نہ کرنے لگیں۔ ہندوستان اور اس کی قومیت کے لئے وہ دن نہایت منحوس ہوگا اگر دہلی اور آگرہ میں مغلوں کی اور بیجاپور میں عادل شاہوں کی نادر روزگار اور عالیشان عمارتیں دیکھکر اور شیر شاہ اکبر یا دکن کی چاند سلطانہ جیسے نامور فرمانرواؤں کے شاندار کارنامے یا محمود گاوان اور ابوالفضل جیسے وزراء باتدبیر کے کارہائے نمایاں پڑھ کر یا البیرونی اور فیضی جیسے حکماء اور مورخین کی تصانیف کا مطالعہ کرکے یا خسرو، غالب اور حالی جیسے بلند پایہ شعراء کا حکیمانہ اور پر درد کلام سن کر ہندوؤں کے دلوں میں فخر و مسرت کی لہریں موجزن نہ ہوں۔۔۔۔ یہ مہر و آشتی کا دور نہ ہوگا۔ جبکہ مذہب و ملت کی تفریق دلوں میں تفریق نہیں پیدا کریگی۔ ہندوستان کی ایک جدید تاریخ ہوگی جس میں محسنوں اور خدمتگزاروں کی داد دیجائیگی اور دلوں میں بجائے عداوت پیدا کرنے کے اتحاد اور قومیت کے گن گائے جائیں گے۔"

اس پورے مسئلہ پر میں نے صرف سر اکبر کی زبان سے بحث کی ہے اور اپنی طرف سے کچھ نہیں ملایا۔ کیونکہ یہ مسئلہ اتنا ہی نازک ہے جتنا اہم سر اکبر نے ادبیات کے سلسلے میں اردو زبان کے مسئلہ کو پیش کیا ہے اور فرقہ وارانہ جامعات کے وجود سے بھی بحث کی ہے۔ سر اکبر نے بتلایا ہے کہ اصول لسان کے لحاظ سے اردو ہندی اور آریائی زبان ہے اور ہندو مسلمان دونوں قوموں کی متفقہ کوشش سے پیدا ہوئی ہے اور اسے قدیم پراکرت سے وہی تعلق ہے جو ہندوستان کی دوسری آریائی زبانوں کو ہے۔ جو شخص مرہٹی۔ گجراتی وغیرہ زبانوں پر اصول لسانی سے نظر ڈالیگا وہ کہے گا کہ بہنیں ہیں۔ اسی ایک ریاست کو لیجئے جس میں کئی مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں۔ جب دو فرقوں یا مقامات کے لوگ ایک دوسرے سے گفتگو کرنا چاہیں تو ان کا ذریعہ اظہار خیالات اردو ہوگا۔ گویا اردو ہم سب میں ایک مشترکہ زبان ہے جو ہمیں ہم خیال اور متفق بنانے میں بڑی معاون ہے۔" اس بحث میں سر اکبر نے اردو کی تائید میں اور بہت سی باتیں پیش کی ہیں لیکن ان کا ذکر طوالت کے خوف سے ترک کر دیا گیا۔ صرف یہ بتلانا مقصود ہے کہ سر اکبر کی زبان میں اتحاد کا ذریعہ مشترک زبان ہے۔ چنانچہ جامعہ عثمانیہ کے متعلق بھی جب کبھی سر اکبر نے کچھ کہا تو

یہی کہا کہ فرقہ وار جامعات مضر ہوتی ہیں اور کوئی طبقہ اپنی مذہبی تعلیم کے لئے تو علیحدہ درسگاہ قائم کرسکتا ہے لیکن عام زندگی کے لئے فرقہ وار یونیورسٹی سم قاتل ہوتی ہے۔ سر اکبر کہتے ہیں کہ فرقہ وار جامعات کے تصور سے مجھے سخت اندیشہ ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس تفریق و نفرت کو جو اس بدنصیب ملک کی اقوام میں موجود ہے اور مشتعل کردے اور اس لئے میں فرقہ وار یونیورسٹیوں کے قیام سے ایک مدت تک بدگمان رہا لیکن اگر موجودہ حالات میں جبکہ یہ جامعات قائم ہوچکی ہیں دیکھا جائے تو اصلاح کی کیا صورت ہوسکتی ہے۔ اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے سر اکبر کہتے ہیں کہ ہندو مسلم یونیورسٹیاں اتحاد و محبت کو پیش نظر رکھکر کام کریں اور ایسے پروفیسر جو ان جامعات میں اتحاد کا پرچار کریں تو بھی مرکز اب ہندو مسلم اتحاد کے لئے بہترین تعلیم گاہ ثابت ہوسکتے ہیں۔

آخر میں ملک کی موجودہ سیاسی تحریکات میں اتحاد، اتحاد کے لئے غیر جماعتی کانفرنس، راجہ جی اور جناح عرض تمام مصلحوں کے سلنخواہ وہ کانگریسی ہوں یا لیگی یا سبھائی یا کسی اور سیاسی جماعت سے تعلق رکھتے ہوں سر اکبر کے اسی مقالے جس کے اقتباسات متعدد مقامات پر پیش کئے ہیں ایک اور چیز پیش کرتا ہوں جس کو سر اکبر نے ۱۹۴۷ء کی کانگریس منعقدہ مدراس میں مسٹر جسٹس طیب جی کی تحریک پر منظور قرارداد کے حوالے سے پیش کیا ہے۔ سر اکبر کہتے ہیں کہ ہندو مسلم سیاسی اتحاد کے لئے بہترین صورت ہوسکتی ہے جو اس قرارداد کے ذریعہ پیش ہوئی ہے وہ یہ کہ جس مسئلہ کو ملک کے مشترکہ سیاسی ادارہ میں جو متحدہ مقاصد کے لئے قائم ہو کوئی طبقہ یا فرقہ اپنے مفاد کے منافی سمجھے زیر بحث نہ آنا چاہئے۔ اور ایسے مسائل کا تصفیہ اسی طبقہ کے غلبۂ آرا سے ہونا چاہئے۔ اگر یہ سوال سر اکبر نے جس طرح حل کرنے کو کہا تھا اسی طرح حل کیا جاتا تو آج ہر طبقہ یا فرقہ کو اپنی کاملیت کے متاثر ہوجانے کا اندیشہ نہ ہوتا۔ سب ملک کی فلاح کے لئے ایک مشترکہ اساس تلاش کرلیتے اور سماج میں جس طرح سر اکبر نے مختلف مقامات پر کہا ہے شعوری زندگی کی ابتداء سے لیکر آخر تک ہندو مسلم اختلاف پیدا ہی نہیں ہوتا تعلیم و تربیت اتحاد پر ہوتی مطالبات کو ایک قوم دوسری قوم کے حالات کو پیش نظر رکھکر سنتی اور فیاضی و ایثار سے قبول کرتی۔ ملک کا وقار دنیا کی دوسری اقوام میں قائم ہوتا۔ آج جس حق خود ارادیت کے لئے مختلف تحریکات شروع کی جاتی ہیں وہ خود بخود حاصل ہوجاتا اور کوئی ہندوستان کی کاملیت کو متاثر نہ کرسکتا۔

آخر میں سر اکبر کا یہ پیغام ہندوؤں اور مسلمانوں تک پہونچا دینا چاہتا ہوں جو ان کی ہمیشہ ہمیشہ تمنا تھی کہ تمام

اقوام ہند بھائی بھائی کی طرح زندگی بسر کریں"۔ یہی تصور حیدرآباد میں بھی سر اکبر کی اصلاحات سے ملے گا جہاں ہر مسئلہ میں تمام اقوام کے ساتھ برابری اور مساوات کا سلوک کیا گیا ہے۔ کیا ہم سر اکبر کو ان کے ان بیش بہا خیالات کی بناء پر یاد کر سکتے ہیں؟ اور اگر یاد کر سکتے ہیں تو کیا سیاسی بنیاد پر اتحاد کی تحریک شروع کرنے کی بجائے سماجی بنیاد پر اتحاد کی بناء ڈالنا سر اکبر کی بہترین یادگار نہیں ہوگی اور کیا یہ ذہنی اصلاح ہندوستان کی قسمت کو نہیں بدل دیگی۔ یہ سوال ہے جو مجلہ عثمانیہ کے اس خصوصی نمبر کو جو سر اکبر کی یاد میں شائع ہو رہا ہے۔ پڑھنے والے خوب سوچیں۔

محمد عبدالحق

متعلم سال چہارم

قطعہ

سینۂ مشرق پہ رقصاں حسن کا رنگیں شباب
نور کے سانچے میں ڈھلتا جا رہا ہے آفتاب
عظمت اکبر سے روشن جامعہ عثمانیہ
کیا دکن کی "صبح صادق" نے اٹھائی ہے نقاب!!

محمد اطہر علی خاں جاوید

سال دوم

سر اکبر — مصلحِ تعلیم

چمنستانِ دہر میں کسی "دیدہ ور" کے پیدا ہونے کے لئے "نرگس" کو کتنی مدت تک آنسو بہانا پڑتے ہیں۔ یہ اقبال ہی سے پوچھئے۔

میکالے نے آج سے برسہا برس پہلے ہندوستان میں انگریزی تعلیم کی بنیادیں رکھیں۔ اس کی رکھی ہوئی بنیادوں پر آج تک کئی عمارتیں "تعمیر" ہو چکیں۔ اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس "تعمیر" میں خرابی کی کتنی ہی "صورتوں" نے جنم لیا لیکن باوجود بڑی بڑی کوششوں کے بھی ۱۹۱۸ء تک ہندوستان کی سرزمین پر کوئی ایسا آشیانۂ علم قائم نہ ہو سکا جو اس "برقِ خرمن" سے محفوظ رہ سکتا۔ یہ فخر غالباً قدرت نے "حلیف" ہی کی ریاست کی قسمت میں لکھا تھا کہ اسی سنہ میں اس ریاست کی سرزمین پر اُس جامعہ کا قیام عمل میں آیا جس میں اُن "دو ہزار سال پرانے علوم" کو زندہ کر دیا گیا۔ جنھوں نے میکالے کے تدبر اور سیاست کے آگے اپنے گھٹنے ٹیک دئے۔ ایک تو خود جامعہ کا قیام اور پھر ذریعۂ تعلیم اس زبان کا قرار دیا جانا جو ہندوستان کی دو بڑی بڑی قوموں کے اتحاد کا سنگم ہے — سونے پر سہاگہ اسے ہی تو کہتے ہیں اور یہی وہ سہاگہ ہے جو سرسید مرحوم بھی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پر نہ چڑھا سکے۔

اسی جامعہ کا بانی اور اسی زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دئے جانے کا حامی ہی تو وہ "دیدہ ور" ہے۔ جس کے لئے نرگس کی آنکھیں رُویا کرتی تھیں۔ یہ شخصیت سر اکبر مرحوم کی تھی۔

ڈاکٹر شیام پرشاد مکرجی کے زبان پر جب اس عظیم شخصیت کا نام آیا تو ان کے نطق نے اُن کی زبان کے یوں بوسے لئے کہ "سر اکبر حیدری کے انتقال سے ہندوستان کا ایک ایسا فرزند اٹھ گیا جو نہ صرف عظیم مدبر کی حیثیت رکھتا تھا بلکہ ایک اسکالر بھی تھا اور علم و ادب کا مُربّی بھی۔"

واقعہ یہ ہے کہ مرحوم کی شخصیت "بجائے خود ایک محشر خیال ہے" کسی ایک شخصیت میں تدبر و سیاست اور علم و ذکا کا ایسا انوکھا امتزاج قدرت ہی کسی کو بخشتے تو بخشتے، سچ تو یہ ہے کہ ایں سعادت بزور بازو نیست۔

سر اکبر کو جس نقطہ نظر سے جانچئے مکمل پائے گا۔ ایک مدبر کی حیثیت سے انھوں نے اپنی سیاست کی داد اُس قوم سے بھی حاصل کرلی جو اعلیٰ ترین "ڈپلومیٹک" دماغ رکھتی ہے۔ ماہر مالیات کی حیثیت سے وہ ایک مسلّمہ شخصیت کے حامل ہیں۔ ایسی ہستیاں شاذ ہی پیدا ہوتی ہیں، جو ایک طرف اپنے ریاستی کاروبار میں حد درجہ محتاط سیاس، زبردست مدبّر، اور انتہا سے زیادہ کاروباری ہوں تو دوسری طرف علم و ادب اور آرٹ اور موسیقی کی دلدادہ ہوں، ایسے ہی آدمیوں کے پیدا کرنے کے لئے بقول میر فلک کو برس ہا برس تگ و دش میں رہنا پڑتا ہے۔

سر اکبر کی زندگی کے دوسرے پہلوؤں سے قطع نظر وہ ایک زبردست مصلح تعلیم بھی تھے۔ سب سے پہلے تعلیم کے اصل مقصد کو ٹٹولئے تو معلوم ہوگا کہ تعلیم کا اصل مقصد یہی ہے کہ اس کے ذریعہ عمدہ شہری پیدا کئے جائیں، اور شرافتِ نفس اور نیک سیرت کے ایسے جذبات کو حرکت میں لایا جائے جو اُن کو حق پسند اور محافظ قوم و انسانیت بنا سکیں"۔

سر اکبر مرحوم کے خالص علمی و تعلیمی مشاغل، اور تعلیمی ترقی کے لئے جو انتھک کوششیں انھوں نے کی ہیں اُن سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے ہمیشہ یہی چاہا کہ تعلیم کی اشاعت بھی ہوتی رہے اور مختلف فرقوں میں ہم آہنگی بھی پیدا ہوتی جائے کلکتہ کی کُل ہند تعلیمی کانفرنس کے خطبۂ صدارت میں سر اکبر نے اپنا دل کھول کر رکھ دیا تھا۔ کہ

"یہ ہندوستان کی قومی ترقی نہ ہوگی اگر مسلمان اشوک اور چندر گپت کی بڑائیوں سے متاثر نہ ہوں، یا ایلورہ اور اجنٹہ کی سنگ تراشی اور مصوری پر خوشی کا اظہار نہ کریں، یا کرشنا اور گوتم بدھ کی تعلیمات سے استفادہ نہ کریں، اسی طرح ہندوستان کی یہ قومی ترقی نہیں بلکہ اس کی موت ہوگی اگر ہندو مغلیہ خاندان کی تعمیرات پر فخر نہ کریں، یا عادل شاہی بادشاہوں کی سیاسی کارگزاریوں کو بنظر استحسان نہ دیکھیں، یا چاند بی بی اور نور جہاں کی بہادری سے متاثر نہ ہوں، یا محمود گاواں اور ابو الفضل جیسے وزراء کی خدمات کی تعریف نہ کریں، یا خسرو اور غالب کی شاعری کی داد نہ دیں"۔

تعلیم کا یہی تخیل جامعۂ عثمانیہ میں پرورش پا رہا ہے، اور کون کہہ سکتا ہے کہ جامعہ عثمانیہ کی تنظیم سر اکبر حیدری کی مرہون منت نہیں ہے؟ جامعہ عثمانیہ کی اس حسین و جمیل عمارتوں کی صوری خوبیوں ہی میں ایلورہ اور اجنٹہ کی ساری سنگ تراشی اور مصوری، مغلیہ تہذیب و تمدن کا سارا نچوڑ رکھ دیا گیا ہے۔ اور ان عمارتوں کی معنوی خوبیوں نے حیدرآباد کو

اردو کا گھر" بنا دیا ہے۔ اور سارے "مشرقی علوم کا گہوارہ"۔

میکالے کے لگائے ہوئے گھاؤ مرہم کی خواہش میں برسوں مُنہ کھولے رہے، تب کہیں جاکر وہ افسوس پھینکنے والا پیدا ہوا جس کا جادو بولا تو سر پہ ہی چڑھ کر بولا، یہی وہ جامعہ تھی جس کے قدم چومنے کے لئے ہندوستان کی زمین مدت تک ترستی رہی۔

ملٹن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اگر وہ "فردوسِ گم گشتہ" کے علاوہ اور کچھ نہ لکھتا تب بھی اس کی یہی ایک نظم اس کی دائمی شہرت کے لئے کافی ہوتی۔ کیا یہ کہنا بجا نہ ہوگا کہ جامعہ عثمانیہ کے قیام و تنظیم کے بعد اگر سر اکبر حیدری کچھ اور نہ بھی کرتے تو یہ کارنامہ اُن کی دائمی شہرت کا ضامن نہ ہوتا؟ لیکن سوال کافی اور ناکافی کا نہیں، سوال تو اس فیض کی گھٹا کا ہے جو برستی ہے تو کھل کر ہی برستی ہے، اور بغیر کھل کے برسے ہوئے کھلتی ہی نہیں۔ حیدری مرحوم کو پھر "اور کچھ" نہ کرنے کا خیال پیدا ہی کیسے ہوتا جب کہ انھوں نے اپنے نزدیک یہ سمجھ لیا تھا کہ "جہالت اور ظلمت سے جنگ کرنا، تاریکی کو رفع کرنا، اور علم کی روشنی پھیلانا جہاد ہے"[1]

یہی وجہ ہے کہ وہ فیض رساں طبیعت نئے نئے چمن پیدا کرتی رہی۔ اگر یہ پوچھا جائے کہ انجمن ترقی اردو اس ادب اور زبان کی محافظ، جو ہندو اور مسلمانوں کے برسہا برس کے میل جول کا نتیجہ ہے کس کی نظرِ کرم سے پروان چڑھی؟ تو سر اکبر مرحوم کے نام نامی کے علاوہ کس کا نام لیا جا سکتا ہے؟ یہ تو خیر اُن الفاظ کی تفسیر ہے جو شیام پرشاد مکرجی نے کہے کہ "سر اکبر علم و ادب کے مربی تھے"۔ لیکن خواجہ غلام السیدین اور سر ضیاء الدین نے جو کہا کہ سر اکبر بہترین ماہر تعلیم تھے" اس کے لئے بہترین ہوگا کہ مرحوم کے تعلیمی نظریوں سے بحث کی جائے۔

بحیثیت مُصلح تعلیم سر اکبر مرحوم کی شخصیت اپنی پوری دلآویزی کے ساتھ اُسی وقت جلوہ گر ہو سکتی ہے جب اُن کو اُن ہی کے نظریوں کی روشنی میں دیکھا جائے۔ حیدری مرحوم نے کئی موقعوں پر تحتانوی تعلیم کے خود مکتفی ہونے پر زور دیا ہے، کیونکہ وہ یہ جان چکے تھے کہ صرف ناخواندگی کا دور کر دینا کافی نہیں، خواندہ آدمی کو اپنے قدموں پر آپ کھڑے رہنے کے قابل بننا چاہئے۔ اور انھوں نے مجلس تعلیمی حیدرآباد دکن کے خطبۂ صدارت میں

---

[1] خطبۂ صدارت مجلس تعلیمی حیدرآباد ۱۹۱۵ء۔

OSMANIA LIBRARY HYDERABAD

اپنے اس نظریہ کو ان الفاظ میں پیش کیا کہ

"تعلیم کے ہر شعبہ کی اصل ابتدائی تعلیم ہے، اور اس لئے جہاں تک ممکن ہو اس کی ترقی و اشاعت میں سعی کرنا ہمارا سب سے بڑا فرض ہونا چاہئے، یہ ضرور نہیں کہ سب کے سب اعلیٰ تعلیم پائیں۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ سب معمولی لکھنا پڑھنا جانتے ہوں" ابتدائی تعلیم زینہ ہے آئندہ اصلاح کا اور انفرادی اور اجتماعی ترقی کا۔ ابتدائی تعلیم کو زیادہ موثر اور وسیع کرنے اور عام لوگوں تک پہنچانے کے لئے مجالس لوکل بورڈ سے کام لینا چاہئے۔"

سر اکبر حیدری مرحوم نے فنی اور صنعتی تعلیم پر بھی کافی زور دیا ہے اور حتی الامکان اس امر کی سعی کی ہے کہ تعلیم بجائے خود مکتفی ہو، اسی نظریہ کے تحت اُن کا نظریۂ تعلیم صرف ذہنی تعلیم تک محدود نہ تھا۔ بلکہ وہ تعلیم میں اُن فنون کو بھی داخل کرنے کے متمنی رہے ہیں جن کا راست تعلق انسان کی معاشرت اور اقتصادی حالت سے ہوتا ہے۔ ہندوستان قدیم کی شہرہ آفاق صنعت و دستکاری نے ان کے دل میں ملک و قوم کے محبت کے جذبات کی پرورش کر رکھی تھی، اور ان کی عین خواہش تھی کہ ہندوستان اس فن میں پھر وہی درجہ حاصل کرلے یہی وجہ ہے کہ وہ تعلیم میں ان فنون کو جگہ دینے کے کوشاں رہے ہیں، اور انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ ملک کو ویسے ہی تاجروں اور دستکاروں کی حاجت ہے، ایلورا اور اجنٹہ کی عمارتوں کو انھوں نے "زندہ مدرسوں" کے روپ میں دیکھا ہے، اور ان زندہ جاوید معلموں سے اکتساب فیض کرنے کے لئے انھوں نے ہمیشہ تلقین کی ہے، اپنے اس فنی تعلیم کے نظریہ کے تحت انھوں نے ۱۹۱۵ء یہ تحریک کی تھی کہ اورنگ آباد میں ایک آرٹ اسکول قائم کیا جائے سچ تو یہ ہے کہ ان کے اُن رنگین خوابوں کی تعبیریں بھی اب ہماری آنکھوں کے سامنے رقص کناں ہیں۔

سر اکبر مرحوم کی مجوزہ فنی تعلیم کا نظریہ دیکھئے کہ اپنے اندر کس قدر گہرائیاں رکھتا ہے، اگر ایک طرف اس کا حاصل کرنے والا اپنے کفالت آپ کرنے کے قابل ہو سکتا ہے تو دوسری طرف ہندوستان قدیم کی شہرہ آفاق دستکاری کے جسد بے جان میں پھر روح داخل ہوتی نظر آتی ہے۔

اس فنی اور صنعتی تعلیم کے علاوہ سر اکبر کے پیش نظر تجارتی تعلیم کی اسکیم بھی تھی، لیکن سیاسی مصروفیات نے غالباً مرحوم کی توجہ کو اس طرف مبذول ہی نہ ہونے دیا، ورنہ یہ مرحلہ بھی طے ہی ہو جاتا۔

ابتدائی اور فنی تعلیم کا ذکر ہو چکا، سر اکبر مرحوم نے تعلیم کے سارے شعبوں پر اپنے خیالات کا نور بکھیرا ہے۔

ثانوی تعلیم کے متعلق انھوں نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس صوبۂ مدراس کے خطبۂ صدارت میں ارشاد فرمایا تھا کہ

"اسی پر اعلیٰ تعلیم کی کامیابی اور ملک کی عام بہبودی کا دار و مدار ہے۔ تعلیم کا یہی درجہ ہے جہاں سے نوجوان طالب علم مختلف پیشوں اور زندگی کے مختلف شعبوں میں دخل دیتے ہیں، اور جو تعلیم انھوں نے حاصل کی ہے اس کا اثر حیات کے تمام مدارج پر پڑتا ہے۔"

واقعہ یہ ہے کہ ثانوی تعلیم کی اساس پر قوموں نے اپنے عروج و منزلت کے مینارے کھڑے کر دئے ہیں۔ سر اکبر حیدری مرحوم نے اپنے خود خطبۂ صدارت میں پرنس سمارک کا جملہ منقول کیا تھا کہ

"اگر میں اپنی قوم میں اس تیاری کو نہ پاتا جو مدارس ثانوی کی تعلیم نے پیدا کر دی تھی تو مجھے یقین نہیں کہ مجھے اپنے کام میں یا اس کام جس میں میں نے حصہ لیا ہے۔ کبھی ایسی کامیابی ہوتی۔"

سر اکبر مرحوم نے پنجاب یونیورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد منعقدہ ۱۹۲۵ء میں جو خطبہ پڑھا اس میں انھوں نے اعلیٰ تعلیم کے نظریہ سے بڑی پر مغز بحث کی ہے اور جامعات کے (Function:) پر ایک عالمانہ تبصرہ کیا ہے، انھوں نے جامعات کو صرف درس و تدریس اور علم و ادب کا گہوارہ نہیں سمجھا بلکہ قوم و ملک کا معمار بنایا ہے، واقعہ یہ ہے کہ اعلیٰ تعلیم ہی متعلم میں مکمل تو خیر نہیں کہا جا سکتا لیکن تقریباً مکمل شعور و ادراک پیدا کرتی ہے، برٹرینڈ رسل نے اپنی کتاب "تعلیم اور سماجی نظام" میں تعلیم کے مختلف نظریوں سے بڑی دقیق بحث چھیڑی ہے، اور اس نے آخر میں چل کر یہی لکھا ہے کہ صحیح نظریۂ تعلیم وہی ہے جو متعلم کو نہ صرف عالم بنائے، نہ صرف عمدہ شہری بنائے، بلکہ حق پسند اور محافظ انسانیت بھی بنا سکے۔ سر اکبر مرحوم کے نظریۂ تعلیم میں بھی اسی نظریہ کی جھلکیاں نظر آتی رہیں، اور ہر نظریۂ تعلیم کو پھیلانے میں اُن کی مساعی جمیلہ یقیناً داد و ستائش سے مستغنی ہیں۔ انھوں نے اپنے مختلف خطبوں میں اپنے بیش بہا خیالات کو رقم کر دیا ہے جس کی روشنی تا دیر قائم رہے گی۔

جامعات کی تعلیم کے متعلق اُن کا قطعی فیصلہ تھا کہ یہ تعلیم صرف اُن چند دماغوں کے لئے مخصوص کر دی جائے جو اس کے اہل ہوں، اور اس قطعی فیصلہ کو انھوں نے ایک موقعہ پر یوں واضح کیا ہے کہ

"میں چاہتا ہوں کہ موجودہ اعلیٰ ثانوی اور کالج کی منزلوں میں سینکڑوں ناکامیابیوں سے جو مصیبت اور پریشانی پھیلتی ہے وہ باقی نہ رہے، میری آرزو یہ ہے کہ اس طرح جو ذرائع تعلیم بچ جائیں ان سے سب سے

پہلے تو عامۃ الناس کی ناگزیر تعلیم کی اصلاح اور بعد میں پیشہ وری اور حرفتی تعلیم و تربیت کے انتظام میں کام لیا جائے تاکہ ملک کی ضرورتوں کے مطابق تعداد کی تعلیم فوقانی مدارس میں ہوسکے۔ اور سب سے آخر میں جامعہ کی مسند میں بہترین ساز و سامان، چند دماغوں کے لئے جو اپنی موزونیت کا ثبوت دے چکے ہوں فراہم کیا جائے۔"

یونیورسٹی کے تعلیم پائے ہوئے افراد کو "معاشرہ کی رُوح" کہا جاتا ہے لیکن ان الفاظ میں صحیح طور پر یعنی اسی وقت پیدا ہوسکتے ہیں جبکہ جامعات میں تعلیم پانے والے افراد کو وہ شراب علم پلائی جائے جو نتھری ہوئی ہو، اور خود جامعات میں وہ فضا موجود ہو جو خالص علمی اخلاقی اور معاشرتی نظریوں کا عطر لئے ہوئے ہو، سر اکبر نے اپنی ضروریات پر پنجاب یونیورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد کے خطبہ میں کافی زور دیا ہے، اور انھوں نے تعلیم کو زیادہ سے زیادہ کامیاب بنانے کے لئے اس کی بھی وضاحت کردی ہے کہ نظام تعلیم کا وطن کی موجودہ ضروریات سے وابستہ کردیا جانا اس کی کامیابی پر دال ہوگا۔

سر اکبر مرحوم "تعلیم نسواں" کا حق بھی نہیں بھولے اور انھوں نے ہر موقع پر تعلیم نسواں کی پُرزور سفارش اور تائید کی ہے، اور اُن کا یہ راسخ عقیدہ تھا کہ ہندوستان کو فی زمانہ تعلیم نسواں کی شدید ترین ضرورت ہے۔ تعلیم نسواں کے سلسلہ میں وہ ایک جوشیلے نوجوان کی طرح پکار اُٹھتے ہیں۔ کہ

"میں پوچھتا ہوں کہ مردوں کو کیا حق ہے کہ وہ لڑکیوں کو اس مقدس اور شریفانہ فرض کے بجالانے سے روکیں؟ برخلاف اس کے ہم کیوں اس فرض کے بجالانے کو اُن کے لئے ناممکن نہیں تو مشکل کردیتے ہیں؟ کیا ہم بنی نوع انسان کے ایک بڑے حصہ کو رُوحانی غلامی کی زنجیروں میں نہیں جکڑ رہے ہیں؟ کیا ہم دانستہ عورتوں کو شریف ترین اور اعلیٰ ترین نیکی یعنی روحانی آزادی سے محروم نہیں کر رہے ہیں؟..... اب ہمیں چاہیئے کہ صدہا سال کا قرض جو ہمارے ذمہ ہے اسے ادا کرنا شروع کریں، اور عورتوں کے جسمانی حسن و جمال پر شائستہ ذہانت حسن کا اضافہ کریں، ہمیں چاہیئے کہ ان کی آنکھوں سے پٹی ہٹا کر انھیں سرچشمۂ علم تک لے جائیں تاکہ وہ بھی از منۂ ماضی و حال کی عقل و حکمت میں حصہ لے سکیں، لغو اور فضول باتوں اور بیہودہ بکواس سے احتراز کریں اور اعلیٰ ترین اور شریف ترین انسانی مسرت یعنی دماغی کامیابی کا لطف اٹھائیں۔"[1]

---

[1] ۔ خطبہ صدارت محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس صوبۂ مدراس۔

سر اکبر حیدری مرحوم کی یہ تمام مساعی جمیلہ ان کے زبردست مصلح تعلیم ہونے پر دال ہیں، واقعتاً تھوڑی دیر کے لئے ایک ہندوستانی شخص کا دماغ حیرت میں آجاتا ہے کہ ایسی شخصیت ہندوستان میں کیسے پیدا ہوگئی، جس نے ہر شعبہ حیات پر اپنی سیاست و تدبر، علم و کمال اور اعلیٰ دماغی کی مہریں لگا دی ہیں۔

بہرکیف سر اکبر حیدری کا نام عرصۂ دراز تک زندہ رہے گا، ان کے کارنامے امر ہیں، اور رانوں میں آسمان پر چمکنے والے ستارے گواہی دیتے رہیں گے کہ کتنی ہی راتیں تھیں جو سر اکبر مرحوم نے ملک و قوم کی بہتری فلاح و بہبود کی گتھیاں سلجھانے میں آنکھوں آنکھوں میں کاٹ دی تھیں۔

مصلح تعلیم کی حیثیت سے تو مرحوم کا نام اس وقت تک لوگوں کے دلوں میں جاگزیں رہے گا جبتک کہ جامعہ عثمانیہ دھرتی کے سینہ پر اپنے قدم رکھے ہوئے ہے، اگر ایسی ہی موت کو مرنا کہتے ہیں تو کون ہے جو اسے نہ قبول کرے گا کہ نظروں سے غائب ہو کر بھی لوگوں کے دلوں میں سمائے رہیں۔

سید محمد یوسف ناظم

متعلم۔ام۔اے (ابتدائی)

سر اکبر اور علمی و ادبی ادارے

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ دنیا میں انسان اپنے کام سے زندہ رہتا ہے۔ خوش نصیب ہیں وہ ہستیاں جو اپنی زندگی میں ایسے مفید کام کر جاتی ہیں جن سے نہ صرف اُس زمانہ کے لوگ بلکہ آنے والی نسلیں بھی متمتع ہوتی ہیں اور ان کا یہ سرچشمۂ فیض رہتی دنیا تک جاری رہتا ہے۔ وہ دنیا میں ایسی غیر فانی یادگاریں چھوڑ جاتے ہیں جن کی وجہ سے انہیں بقائے دوام حاصل ہوتی ہے۔ ابتدائے آفرینش سے لیکر اب تک صدہا بادشاہ اور دولتمند پیدا ہوئے اور مر کھپ گئے۔ زمانے نے انہیں حرفِ غلط کی طرح صفحۂ ہستی سے مٹا دیا اور آج کوئی اُن کے نام و نشان سے تک واقف نہیں لیکن ان میں سے جنہوں نے رفاہِ عام کے کام کئے، دنیا آج تک ان کو اچھے الفاظ کے ساتھ یاد کرتی ہے اور دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا انقلاب ان کے لافانی کارناموں پر پردہ نہیں ڈال سکتا۔ حضرت سعدی نے اس حقیقت کو ایسے انوکھے انداز سے اجاگر کیا ہے کہ اس سے انکار بن نہیں پڑتا ؎

بس نامور بزیر زمیں دفن کردہ اند
کز ہستیش بروئے زمیں یک نشاں نماند
زندہ است نام فرخ نوشیرواں بعدل
گرچہ بسی گزشت کہ نوشیرواں نماند

سر اکبر مرحوم بھی اُن چند خوش نصیب انسانوں میں سے تھے جنھوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ ملک کی فلاح و بہبود کے کاموں میں گزارا۔ آج ہم ان کو ایک اعلیٰ عہدہ دار کی حیثیت سے یاد نہیں

کر رہے ہیں بلکہ اُن کے اوصافِ حمیدہ اور مساعی جمیلہ نے ہمیں اس بات پر مجبور کر دیا ہے کہ آج ہم نہ صرف اُن کی خدماتِ جلیلہ کا اعتراف کریں بلکہ ان کا خراجِ تحسین بھی ادا کریں۔

سر اکبر ایک غیر معمولی شخصیت اور فوق فطری تدبر کے حامل تھے۔ ان میں وہ تمام اوصاف بدرجۂ اتم موجود تھے جو بڑے آدمیوں میں ہونے چاہئیں۔ علمی لیاقت، معاملہ فہمی، بیدار مغزی اور اعلیٰ دماغی تو اُن کی نمایاں خصوصیات تھیں ہی لیکن ان کی خدا پرستی، خوش اخلاقی، علمی و ادبی ذوق جوہر شناسی اور اہل کمال کی قدر دانی وہ صفات تھیں جن کی وجہ سے وہ دوسروں سے ممتاز ہو کر ایک ایسے درجہ پر پہنچ گئے تھے جہاں بہت کم لوگوں کا گزر ہوتا ہے۔

وہ نہ صرف ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے بلکہ علم و ادب کی خدمت کا مقدس جذبہ شروع ہی سے ان کی رگ و پے میں سرایت کر گیا تھا اور وہ کبھی اس خدمت سے غافل نہیں رہے بلکہ ہر وقت علمی و ادبی اداروں اور انجمنوں کی سرپرستی کی۔ چنانچہ ۱۸۸۸ء میں جب ناگپور میں ملازم تھے تو وہاں کی ایک مشہور انجمن کی دو امی سرپرستی قبول کی جس کے تحت ایک مدرسہ کا قیام عمل میں آیا جو رفتہ رفتہ ترقی کر کے فوقانیہ کے درجہ تک پہونچ گیا۔ الہ آباد کے قیام کے زمانہ میں سنٹرل کالج کے سمیع اللہ خاں بورڈنگ ہاوز کی ترقی کے لئے انہوں نے جو کوششیں کیں ان سے الہ آباد کے رہنے والے اچھی طرح واقف ہیں یہاں انہوں نے مختلف علمی و ادبی جلسوں میں بھی حصہ لیا۔ جب الہ آباد سے مدراس روانہ ہوئے تو وہاں بھی اپنی سرکاری مصروفیات کے بعد جو وقت بچ رہتا علمی و ادبی کاموں میں صرف کرتے۔ چنانچہ مدراس کی "محمڈن لیٹریری سوسائٹی" کی وہ خدمات انجام دیں جن کو اہل مدراس ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ حیدرآباد میں علم و ادب کی نشو و نما میں سر اکبر کا خاص حصہ ہے۔ چنانچہ سرکاری امداد کے علاوہ خود بھی ذاتی طور پر دلچسپی لی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آئے دن حیدرآباد میں علمی و ادبی اداروں کا قیام عمل میں آتا گیا اور ان کی ترقی کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔

حیدرآباد میں علمی و ادبی فضا پیدا کرنے میں حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس نے سب سے زیادہ اور نمایاں حصہ لیا ہے۔ اس انجمن نے علم و ادب کی وہ گراں بہا خدمات انجام دی ہیں کہ اہل حیدرآباد ان کو

بھلا نہیں سکتے۔ یہی وہ انجمن ہے جس نے جامعہ عثمانیہ کے قیام کی نسبت بار بار حکومت کو توجہ دلائی اور جامعہ کی تشکیل میں بہت بڑا حصہ لیا۔ یہ انجمن علم و ادب کی ایسی گراں بہا خدمات انجام نہ دے سکتی اگر اسے سر اکبر حیدر نواز جنگ جیسا علم دوست، قابل اور ہمدرد صدر نہ ملتا۔ سر اکبر اس کانفرنس کے اولین صدر تھے۔ ان ہی کی قابلانہ رہنمائی میں انجمن نے سارے ملک میں علم و ادب کی لہر دوڑا دی۔ اس انجمن کا پہلا اجلاس ۲۷ و ۲۸ فروری ۱۳۲۴ف کو محبوب ٹاؤن ہال میں سر اکبر حیدر نواز جنگ کی صدارت میں ہوا تھا۔ سر اکبر نے اس اجلاس میں جو خطبۂ صدارت پڑھا تھا اس کا مختصر سا اقتباس درج ذیل کیا جاتا ہے۔

"کم استطاعت اور ہونہار طلبہ کی امداد کرنا ہمارا فرض ہے، ان ہی کنکروں میں جواہر بھی ہوتے ہیں اور کیا معلوم کہ انہیں سے ایسے لوگ پیدا ہوں جو ہمارے ملک کے لئے باعث فخر ہوں۔ ایسے لڑکوں کی مدد کرنا اپنے ملک کی مدد کرنا ہے جہاں ہم اپنی ذات کے لئے اتنا کچھ کرتے ہیں وہاں ہم تھوڑا سا کچھ اپنے ملک کے لئے بھی کریں۔ ہم دنیا میں تنہا نہیں ہیں اور نہ ہو سکتے ہیں۔ خلوص و ایثار اور جوش و صداقت سے کام لیں۔ جہالت کا مقابلہ کریں اور علم کا نور تمام ملک میں پھیلائیں۔"

مندرجۂ بالا عبارت سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سر اکبر کو حیدر آباد کی تعلیمی ترقی سے کس قدر دلچسپی تھی اور کیوں نہ ہوتی جب کہ انہوں نے حیدر آباد کو اپنا وطن بنا لیا تھا اور اس سرزمین کو اپنی آخری آرام گاہ کے لئے پسند کیا تھا۔ غرض ان کی ساری ہمدردیاں اس انجمن کے ساتھ تھیں اور حیدر آباد میں تعلیم کو عام کرنا ان کا مقصد بن گیا تھا۔ چنانچہ اس خطبہ میں ایک جگہ اپنے دلی منشا کا اظہار کیا ہے۔

"میرا دلی منشا ہے کہ اس ملک میں تعلیم عام ہو اور علم کی روشنی سے سارا ملک منور ہو جائے مجھے ابتدائے ملازمت سے جہاں جہاں میں رہا تعلیم سے خاص دلچسپی رہی۔ جو عزت کہ آپ نے مجھے اس مجلس کے اجلاس اول کی صدارت کی بخشی ہے اس کا میں تہہ دل سے ممنون ہوں اور اس موقع کو میں اپنی زندگی میں ہمیشہ فخر و مباہات کے ساتھ یاد رکھوں گا۔"

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس نے حیدرآباد میں جو تعمیری کام انجام دیا ہے اس کے لئے وہ مبارکباد ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اس حقیقت کو فراموش نہیں کیا جاسکتا کہ اگر سر اکبر اور دوسرے صاحب اقتدار عہدہ دار اور ہی خواہانِ ملک کی رہنمائی اور ہمدردیاں اس کے ساتھ نہ ہوتیں تو انجمن وہ نہ کرسکتی جو کیا ہے۔

دارالعلوم حیدرآباد کی سب سے قدیم درسگاہ ہے۔ اس نے ایسے ایسے لائق سپوت پیدا کئے جن پر حیدرآباد بجا طور پر فخر کرسکتا ہے۔ اس درسگاہ کے طالب علموں نے علم و ادب کی ترقی کے لئے ۱۳۱۲ف میں ایک انجمن "ثمرۃ الادب" کی بنیاد ڈالی۔ ابتدائی بارہ ۱۲ سالوں میں کچھ زیادہ کام نہیں ہوا۔ ارکان انجمن نے اپنے لائحہ عمل میں کچھ تبدیلیاں کرکے دور جدید کا آغاز کیا۔ چنانچہ اس کا پہلا جلسہ ۱۳۲۴ف میں سر اکبر کی صدارت میں ہوا۔ اس سال انجمن نے علم و ادب کی بڑی خدمت انجام دی اور طلبہ میں علم و فضل سے دلچسپی بڑھتی گئی۔ چنانچہ ۱۳۲۷ف میں اس انجمن کی طرف سے ایک رسالہ "ثمرۃ الادب" شائع ہونے لگا اور کلیہ جامعہ عثمانیہ کے قائم ہونے تک یہ انجمن برابر علم و ادب کی خدمت انجام دیتی رہی۔ اور بعد کو دارالعلوم کالج کے ساتھ یہ انجمن بھی کلیہ جامعہ عثمانیہ میں ضم ہوگئی۔

انجمن ترقی اردو ہندوستان کی ان چند قابل قدر انجمنوں میں سے ہے جو علم و ادب کی خدمت میں ہمہ تن مصروف ہے۔ اس انجمن کو بام ترقی پر پہونچانے میں سر اکبر کی خاص توجہ ہمدردی اور امداد کا بہت بڑا حصہ ہے۔ چنانچہ ۱۹۱۷ء میں سر اکبر کی مساعی جمیلہ سے اعلیحضرت سلطان العلوم خلداللہ ملکہٗ وسلطنتہٗ نے ازراہ علم پروری انجمن ترقی اردو کو مستقلاً پانچ ہزار کی امداد مرحمت فرمائی۔ جب انجمن نے اردو لغت کی اکیم حکومت حیدرآباد کے سامنے پیش کی تو سر اکبر نے بطور خاص دلچسپی لے کر لغت کی ترتیب کے لئے تین ہزار روپیہ کی منظوری عطا کی نیز انجمن کی سالانہ امداد میں بہت کچھ اضافہ کیا اور اب اس انجمن کو مجموعی طور پر سالانہ تقریباً پچاس ہزار روپیہ امداد ملتی ہے اور یہ سر اکبر کی علم دوستی اور ادب نوازی کا ایک ثبوت ہے۔ ۱۹۳۹ء میں انجمن ترقی اردو کی کہانی" کے نام سے ایک کتاب شائع ہوئی جس میں سر اکبر کی علمی اور مالی امداد کا اس طرح اعتراف کیا گیا ہے۔

"انجمن سر اکبر حیدری نواب حیدر نواز جنگ بہادر کے احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہوسکتی

جناب ممدوح کو ابتدا سے انجمن کے اغراض سے ہمدردی تھی۔ باوجود کثرت مشاغل اور عدم فرصت کے آپ نے ہر موقع و محل پر انجمن کی تائید فرمائی اور یہ آپ ہی کی حسن توجہ اور مسلسل سعی و تحریک کا نتیجہ تھا کہ انجمن کی مالی حالت قابل اطمینان ہوگئی۔"

سر اکبر کی علمی و ادبی زندگی کا سب سے زیادہ درخشاں کارنامہ جامعہ عثمانیہ کا قیام ہے۔ جامعہ عثمانیہ کی تحریک، تاسیس اور اس کو عملی جامہ پہنانے میں سر اکبر نے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ ان کی ان تھک مسلسل کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج ہماری جامعہ ممتاز جامعات میں شمار ہونے لگی ہے۔ سر اکبر شروع ہی سے ایک ایسی جامعہ کے قیام پر غور کر رہے تھے جس کا ذریعۂ تعلیم مادری زبان ہو۔ چنانچہ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے پہلے اجلاس کے خطبۂ صدارت میں اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

"خدا نے چاہا تو چند سال میں دارالعلوم ایک عظیم الشان یونیورسٹی ہو جائے گا۔ جس کی نظیر ہندوستان بھر میں نہ ہوگی اور جس کا فیض دور دور تک پہنچے گا اور لوگ ملک ملک سے اس سے مستفید ہونے کے لئے آئیں گے اور حیدرآباد مرکز علوم و فنون بن جائے گا۔"

سر اکبر نے محض رسمی طور پر یہ نہیں کہا تھا بلکہ جامعہ کی تشکیل ہمیشہ ان کے پیش نظر رہی۔ چنانچہ انہوں نے ہندوستان کے مشہور ماہرین تعلیم ڈاکٹر ٹیگور اور مسٹر ڈی اے اسمتھ سے اس بارے میں رائے لی اور ایک اسکیم مرتب کر کے ۱۳۳۶ھ میں قیام جامعہ کی اجازت کے لئے بارگاہ سلطانی میں عرضداشت پیش کی جس کو سلطان العلوم نے شرف قبولیت سے مفتخر فرمایا اور یکم محرم الحرام ۱۳۳۵ھ سے اس جامعہ کا قیام عمل میں آیا۔ سر اکبر نے اس جامعہ کو قائم کر کے مادری زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے کا ایک عملی تجربہ کیا تھا جو صد فی صد کامیاب ثابت ہوا۔ جامعہ عثمانیہ کو ترقی دینے میں انہوں نے جو تجویزیں اٹھائی ہیں اور جس خلوص و انہماک سے اس کے وقار کو بلند کرنے کی سعی و کوشش کی ہے وہ اہل اردو سے پوشیدہ نہیں۔ سر اکبر کو جامعہ سے گہری دلچسپی اور دلی محبت تھی۔ ان کو اپنے اس کارنامہ پر بڑا ناز تھا حتیٰ کہ وہ اپنی سیاسی خدمات پر بھی اس کو فوقیت دیتے تھے۔ مادر جامعہ اپنے اس محسن اعظم کی جتنی بھی قدر کرے

کم ہے۔

سر اکبر نے ۱۳۴۲ف کے جلسۂ تقسیم اسناد میں جو خطبہ پڑھا تھا اس کے مطالعہ سے ان کے تدبر تعلیمی دلچسپی اور بالخصوص جامعہ عثمانیہ سے ان کی والہانہ محبت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس خطبہ کے بعض ٹکڑے اپنی اہمیت اور افادیت کا لحاظ کرتے اس قابل ہیں کہ بہی خواہان جامعہ اسے اپنے پیش نظر رکھیں۔

"وہ جامعہ کو دیکھکر میرا دل بڑھتا ہے جیسے بیٹے کو دیکھکر باپ کا دل بڑھا کرتا ہے جب تک میں اعلیحضرت واقدس کے زیر عاطفت حیدرآباد میں ہوں اس جامعہ کو مزید ترقی دینے اور اس کی شوکت وعظمت میں اضافہ کرنے کی سعی کرتا رہوں گا۔ کوئی رکاوٹ مجھے اس سے نہیں روک سکتی۔ میں جامعہ کے خیال سے ایک لمحہ بھی غافل نہیں رہتا۔"

جامعہ عثمانیہ کا تذکرہ نامکمل رہ جائے گا اگر اس کے دارالترجمہ کے متعلق کچھ نہ کہا جائے۔ جامعہ کے قیام کے ساتھ سر اکبر نے دارالترجمہ کے قیام کو بھی بہت ضروری سمجھا جس کی وجہ سے جامعہ عثمانیہ کا پایہ مستحکم تر ہو گیا۔ سر اکبر نے اپنی نشری تقریر "حیدرآباد جدید" میں جو ۱۲ مارچ ۱۹۳۶ء کو نشرگاہ دہلی سے نشر ہوئی تھی اس کا ذکر کیا ہے۔

"اس کی حیات بخش کامیابیوں کی نظیر صرف اس دور عباسی میں بغداد میں ملتی ہے جبکہ یونانی زبان سے فلسفہ اور طب کی تمام کتابوں کے ترجموں نے مشرق کے علم میں اضافہ کیا تھا"

اب تک جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس کا ماخذ زیادہ تر سر اکبر کے خطبات اور بعض کتابیں ہیں یا وہ حقائق ہیں جن کا دور سے میں نے مطالعہ کیا ہے۔ اب میں اس حقیقت کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا جسے میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور جس کا میرے دل نے نہ صرف اندازہ کیا ہے بلکہ محسوس بھی کیا ہے۔ اس سے میری مراد "ادارہ ادبیات اردو" ہے۔ یہ ادارہ تقریباً ۱۲ سال سے ملک میں علم وادب کی جو گراں بہا خدمات انجام دے رہا ہے اس سے اہل ملک ناواقف نہیں۔ یہ ناممکن تھا کہ ایسے کارکن ادارے کو سر اکبر جیسے علم وادب کے قدردان کی سرپرستی حاصل نہ ہوتی۔ میں یہاں ان وجوہ کا بیان کرنا غیر ضروری خیال کرتا ہوں جن کے باعث ایک عرصہ تک سر اکبر اس ادارہ سے دور رہے لیکن اس امر واقعہ کا اظہار بھی ضروری ہے کہ جب اس ادارہ کی ٹھوس

خدمات کا سر اکبر کو علم ہوا تو انہوں نے ۱۹۳۹ء میں اس ادارہ کو ایک ہزار روپئے کا عطیہ دے کر اس کی سرپرستی قبول کی اور اس کی علمی و ادبی سرگرمیوں سے روز بروز قریب تر ہوتے گئے۔ چنانچہ ۱۹۴۰ء میں انہوں نے تقریباً دو گھنٹے ادارے کے نادر علمی و ادبی ذخیرے کے معائنہ میں صرف کئے۔ اردو انسائیکلو پیڈیا کی اسکیم اور اس کے طرز کار کا حال معلوم کر کے اپنی خوشنودی اور امداد کا وعدہ کیا اور چند ہی دن بعد انسائیکلو پیڈیا کی اشاعت کے لئے اپنی اقتداری رقم میں سے ۵ ہزار روپیہ بطور امداد دینے کی منظوری صادر کی۔

چونکہ ادارے کا دفتر اور کتب خانہ اب تک جناب ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور کے مکان میں ہے اور اس وقت بھی یہ مکان اس کے لئے بالکل ناکافی تھا' اس لئے سر اکبر نے یہ محسوس کیا کہ ادارہ کو ایک علیحدہ مستقل عمارت ملنی چاہیئے۔ چنانچہ انہوں نے اس بارے میں کارروائی بھی شروع کر دی تھی اور توقع تھی کہ بہت جلد ادارہ کے لئے کوئی عمارت مل جاتی لیکن انہی دنوں سر اکبر اپنی خدمت صدر اعظمی سے سبکدوش ہو گئے اور ادارہ کی عمارت کا مسئلہ ادھورا ہی رہ گیا اور اب تک اسی حالت میں پڑا ہوا ہے۔ نہ معلوم وہ وقت کب آئے گا کہ ادارہ کے لئے کوئی مستقل عمارت مل جائے۔ سر اکبر نے ادارہ کا جس دلچسپی اور انہماک کے ساتھ تفصیلی معائنہ کیا اس کو دیکھنے کے بعد یہ ماننا پڑا کہ حیدر آباد کے عہدہ داروں میں اگر کسی کو علمی و ادبی اداروں سے دلچسپی اور ہمدردی تھی تو وہ صرف سر اکبر کی ہستی تھی۔ ادارہ کے معائنہ کے بعد اس سے انہیں خاص ہمدردی پیدا ہو گئی تھی۔ چنانچہ انہوں نے ۱۹۴۰ء میں ادارہ کے اردو امتحانات کے جلسۂ تقسیم اسناد میں جو خطبہ پڑھا تھا اس کے اقتباس سے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

"دو ادارۂ ادبیات اردو گزشتہ دس سال سے اردو زبان اور ادب کی ٹھوس خدمت کر رہا ہے اور مجھے بڑی خوشی ہوئی جب میں نے گزشتہ ہفتے میں اس کا معائنہ کر کے معلوم کیا کہ اس ادارے کے کارکنوں میں علم و ادب کا ذوق اور تحقیق و جستجو کا مادہ موجود ہے۔ چنانچہ میں نے دیکھا کہ بہت سا ایسا مواد جمع کر لیا گیا ہے جو کام کرنے والوں کے لئے مفید ثابت ہوگا اور جس کی اشاعت و حفاظت ہر ترقی یافتہ قوم کا مقدس فریضہ ہے۔ جب اس ادارہ کی

ایک ذاتی عمارت بن جائے گی تو مجھے یقین ہے کہ وہ حیدرآباد میں تصنیف و تالیف اور علم و فضل کا ایک اچھا مرکز ثابت ہوگا۔"

غرض حیدرآباد کا کوئی ایسا علمی و ادبی ادارہ نہ ہوگا جس سے سراکبر کو دلچسپی نہ ہو۔ چنانچہ انجمن طبیبان عثمانیہ کے سالانہ جلسہ منعقدہ ۱۳۴۲ف کی صدارت کی اور ایک بصیرت افروز خطبہ پڑھا۔ اردو گشتی کتب خانہ کی شروع ہی سے مالی امداد کرتے رہے اور اس کتب خانہ نے ان کی مالی اعانت سے بہت کچھ ترقی کی اور اس کے بانی نے سراکبر کی سرپرستی کے اعتراف میں اس کا نام بدل کر "حیدری گشتی کتب خانہ" رکھا۔ حیدرآباد سے انگریزی زبان میں ایک بلند پایہ علمی و تحقیقی رسالہ "اسلامک کلچر" شائع ہوتا ہے جس کو سراکبر ہی نے جاری کیا تھا۔ حیدرآباد سے باہر کئی علمی و ادبی اداروں کی سراکبر نے حکومت حیدرآباد کی طرف سے مالی امداد دی جس میں سے بنگلور انڈین انسٹیٹیوٹ آف سائنس کو سالانہ دس ہزار جامعہ ملیہ اسلامیہ کی عمارت کے لئے پچاس ہزار یکمشت اور ایک ہزار ماہوار مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو دس لاکھ یکمشت اور ماہانہ دو ہزار کاروے زنانہ یونیورسٹی پونہ کو ۵ ہزار یکمشت اور پچاس روپے ماہوار کی امداد جاری کرائی۔ ان کے علاوہ آندھرا یونیورسٹی ہندو یونیورسٹی بنارس اور اسلامیہ کالج پشاور کو بھی ایک معتدبہ رقم بطور امداد حکومت حیدرآباد کی طرف سے دلائی

بہرحال سراکبر نے علمی و ادبی اداروں کے ساتھ جس دلچسپی اور ہمدردی کا اظہار کیا اور ان کو مالی امداد دے کر پھلنے پھولنے کا موقع دیا وہ ان کے نام کو علمی و ادبی دنیا میں ہمیشہ زندہ رکھنے کی ضامن ہے۔

خواجہ حمید الدین بی اے (عثمانیہ)
متعلم ایم اے (ابتدائی)

مسٹر کرشنن کی رخصتی ۔ ۱۳۵۲ف

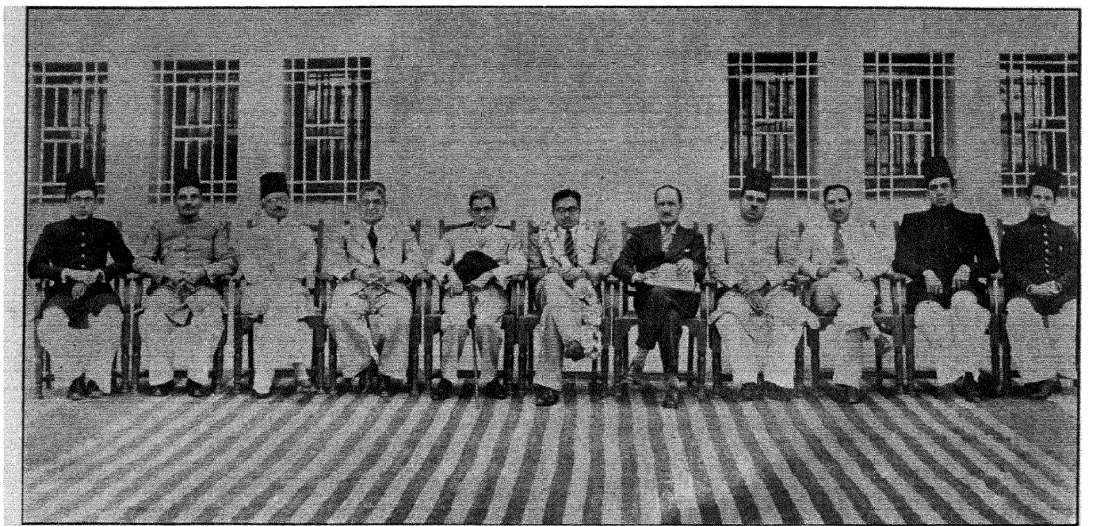

بائیں جانب سے :۔(۱) سید محمد اشہد خانصاحب رضوی ۔(۲) مظہر اللہ صاحب ۔(۳) عبدالمجید صاحب صدیقی ۔(۴) پروفیسر وحیدالرحمن ۔(۵) پروفیسر قاضی محمد حسین
مدیر حصہ اردو اول مددگار مسجل پراکٹر خازن اعزازی نائب معین امیر جامعہ
(۶) مسٹر وی ۔ ایس ۔ کرشنن ۔ (۷) پروفیسر حسین علی خاں ۔ (۸) ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ۔ (۹) ضیاء الدین صاحب انصاری
مشیر حصہ انگریزی پرووسٹ ۔ مشیر حصہ اردو سینیر پراکٹر
(۱۰) سید علی محمد موسوی ۔ (۱۱) میر حامد علی صاحب ۔
مہتمم مدیر و مدیر حصہ انگریزی نائب مدیر حصہ انگریزی

کی ڈگری حاصل کی۔

سر اکبر کی خدمات برطانوی ہند میں

بی اے ہونے کے بعد بی ایل کی تیاری میں مصروف تھے کہ گورنمنٹ بمبئی کی جانب سے انڈین فینانس کے امتحان میں شریک ہونے کے لئے انتخاب کیا گیا اس امتحان میں آپ نے بدرجہ اول کامیابی حاصل کی۔ یہیں سے آپ کی ترقیوں کا سلسلہ شروع ہوا چنانچہ ۱۸۸۸ء میں ناگپور کے صیغہ حساب میں ایک آفیسر کی حیثیت سے امور کیا گیا جہاں پر آپ نے مالیہ کے کاروبار کو ایک سال تک بحسن و خوبی انجام دیا۔ اس کے علاوہ آپ کے قیام ناگپور نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اتحاد کی ایک کڑی کو قائم رکھا۔ یہ آپ کا پہلا قومی کارنامہ ہے جس کی یاد آج تک دونوں اقوام کے دلوں میں تازہ ہے ۱۸۸۹ء میں کرنسی آفیسر لاہور میں منتقل کر لئے گئے۔ اس کے چار پانچ مہینے بعد آپ کو کلکتہ بھیجا گیا۔ ۱۹۰۱ء میں مدراس پریذیڈنسی کے ڈپٹی اکونٹنٹ جنرل مقرر ہوئے۔ یہاں پر یہ اچھی طرح واضح رہے کہ آپ پہلے ہندوستانی ہیں جنھیں اس قسم کے اعزاز سے سرفراز فرمایا گیا اس زمانہ میں ہندو مسلم اتحاد پر جو بصیرت افروز تقریر فرمائی تھی وہ کسی طرح فراموش نہیں کیجا سکتی جس میں آپ نے دور اندیشانہ خیالات کا اظہار فرمایا تھا۔ آپ سچے محب وطن کی حیثیت سے سرکاری خدمات کو انجام دیتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ ہندوستان کے اتحاد کو ترقی دینے کے متمنی رہتے جس کو وہ نہ صرف جغرافیائی حالات بلکہ ثقافتی اور روحانی استحکام پر مبنی خیال کرتے تھے۔ آپ کی ساری زندگی دو بڑی قوموں کو متحد کرنے کے لئے وقف تھی

حیدرآباد میں آمد

سرزمین دکن میں سر اکبر نے ۱۹۰۵ء میں ایک عظیم مدبر کی حیثیت سے قدم رکھا ان کی خدمات عہدۂ صدر محاسبی کے لئے ماہر فینانس ہونے کی بنا پر سرکار عالی نے مستعار لی تھیں اس زمانہ میں سر چارلز کیسن واکر وزیر مالیات کے پیش نظر بہت سی مالیاتی اصلاحیں تھیں۔ سر اکبر کی قابلیت اور ہمہ گیر صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے سر چارلز نے سرکار سے خواہش کی کہ سر اکبر کو معتمدی فینانس پر ترقی دی جائے تاکہ مالیاتی اصلاحات میں مشورہ کیا جا سکے۔ چنانچہ ۱۹۰۷ء

میں آپ کو معتمدی فینانس کے عہدے سے سرفراز فرمایا گیا۔ اس عہدے پر فائز ہو کر آپ نے فینانس کے اصلاحی اور انتظامی امور میں سرجارج کو خاطر خواہ مدد دی جس کا اعتراف سرجارج نے اپنے بجٹ نوٹ میں اس طرح کیا ہے۔

"گذشتہ نو سال کے فینانس کے کاروبار کے جو منافع مختصر طور پر بیان کئے جاتے ہیں۔ ان میں گذشتہ پانچ سال تک اول بحیثیت صدر محاسب ازاں بعد بحیثیت معتمد فینانس مسٹر حیدری نے نمایاں اور موثر طور پر حصہ لیا۔ جہاں تک مقامی حالات اجازت دیتے تھے ریاست کے مخارج پر زیادہ اثر پذیر طریقے سے قابو حاصل کر لیا گیا ہے اور جو امور فینانس سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان پر سررشتۂ فینانس اپنے اقتدارات کو کام میں لانے کا مجاز ہے۔"

اس نوٹ کو پڑھنے کے بعد ہر ذی شعور انسان سر اکبر کی کارگذاری کی داد دئے بغیر نہیں رہ سکتا جنھوں نے ان اصلی کمزوریوں کو معلوم کیا جو منافع کی سدِ راہ تھیں۔ اس کے تین سال بعد یعنی ۱۹۱۱ء میں امور عامہ کے معتمد مقرر ہوئے۔ یہاں پر بھی اپنی اعلیٰ کارگذاریوں کو ہاتھ سے جانے نہ دیا بلکہ اپنی عادت کے مطابق سخت محنت و مشقت کے ساتھ معتمدی کے فرائض کو انجام دیتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کو ۱۹۲۰ء میں چند روز کے لئے بمبئی کے اکاونٹنٹ جنرل کے عہدے سے سرفراز فرمایا گیا۔ اور اس کے ایک سال بعد ۱۹۲۱ء میں دوبارہ حیدرآباد تشریف لائے اور آپ کو مالیات کی وزارت سپرد کر دیگئی اس عہدے پر فائز ہونے کے بعد مالیات کی اصلاحات کی طرف توجہ مبذول فرمائی۔

مالیاتی اصلاحات آپ کے کرسئ وزارت مالیات پر متمکن ہونے سے قبل حکومت کو پچھتر لاکھ روپیہ قرض کی ضرورت محسوس ہوئی تھی جس کی گنجایش کسی صورت سے نکلنا ناممکن تھی۔ سر اکبر نے چند ایسی مفید اصلاحیں کیں جن کے بعد حکومت کو قرض لینے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔ مثلاً خرد سے کے نرخ کی اصلاح۔ موازنہ کی ترتیب۔ سبیل بندی، کھتاونی

محکمہ بندی، مداخل ومخارج پر نگرانی، شمول وخروج پر تنقیدی نظر، محکمہ حساب کی طمانیت صوبہ واری اور ضلع واری حسابات کی جانچ پڑتال اور جا وبیجا خرچ پر محاسبہ سر اکبر کے نامساعد فینانس ممبری اور وزارت مالیات کے عدیم النظیر کارنامے ہیں۔ کساد بازاری اور اقتصادی مشکلات کو ختم کرنے کے لئے مختلف قسم اور نئی نئی اسکیمیں جاری فرمائیں جس کا خوش آیند نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارے مالیہ کا استقرار و توازن اپنی آپ نظیر بنا ہوا ہے۔ چنانچہ اسی زمانہ میں کسی ٹیکس کے عائد کئے بغیر ہم نے ریلوے کا سودا کیا اور اس کی جملہ رقم نقد داخل کیگئی۔ علاوہ ازیں سر اکبر نے اپنی حسابی قابلیت اور حسن تدبر سے پانیل لاکھ کی گنجایش نکالی۔ ۱۹۲۴ء میں مجموعی طور پر دو کروڑ ۶۱ لاکھ کی کثیر رقمی بچت ہوئی جس میں سے ریلوے کی خریدی کے لئے ایک وافر رقم مدمحفوظ میں رکھ دیگئی اور باقی رقومات۔ قحط، تعمیراتی کاروبار آب باشی کے انتظامات آرائش بلدہ، عثمانیہ ٹکنیکل انسٹیٹیوٹ اور جامعہ عثمانیہ کی عمارات کے لئے محفوظ کی گئیں۔ اسی طرح ۱۹۲۷ء کی بچت مجموعی طور پر ۳ کروڑ ۴۵ لاکھ تھی جس میں سابقہ غیر منقسم بچت کی رقم بھی شامل کی گئی۔ اس طرح سے جملہ رقومات کی مقدار ۳ کروڑ ۹۱ ½ لاکھ تک پہنچ گئی سر اکبر کی اس کارگزاری اور حسن تدبر کو دیکھ کر اعلیحضرت بندگانعالی نے استقرار موازنہ کے سلسلے میں اظہار خوشنودی فرمایا جس کا اہم اقتباس درج ذیل ہے۔

"موازنہ جو اطمینان بخش ہے، منظور کیا جاتا ہے اور جامعہ عثمانیہ کے عمارات کی تکمیل اور سنٹرل سکرٹریٹ اور پولس بیارکس کی تعمیر کی جو تجاویز پیش کی گئی ہیں وہ بھی منظور کی جاتی ہیں ..... سر اکبر حیدری نے اپنے فینانس ممبری کے زمانہ میں طریقۂ سہیل بندی کو رائج کرنے کے بعد موازنہ کا توازن قائم رکھ کے ہر صیغہ کی ترقی کے لئے معتدبہ رقم ہر سال شریک موازنہ کرکے ملک کی ترقی میں جو نمایاں حصہ لیا ہے۔ اس سے میں بخوبی واقف ہوں اور ان کے فینانشیل تدبر اور دور اندیشی کی قدر کرتا ہوں۔ ان سے میری خوشنودی کا اظہار کیا جائے"

یہ ہیں ذات شاہانہ کے وہ الفاظ جو سر اکبر کے تدبر اور مالیاتی قابلیت کے شایان شان ہیں جن کو

کسی طرح بھلایا نہیں جاسکتا۔

جس طرح آپ کو الہیاتی قابلیت فطری طور پر ودیعت کی گئی تھی۔ اسی طرح تعلیمی امور سے بھی خاصہ لگاؤ تھا۔ چنانچہ آپ کو علمی دنیا میں یہ امتیاز حاصل ہے کہ آپ متعدد یونیورسٹیوں یعنی مدراس، بمبئی، ڈھاکہ علیگڈھ اور حیدرآباد کے "فیلو" رہ چکے ہیں۔ اسی طرح مختلف جامعات سے آپنے اعزازی ڈگریاں حاصل کیں چنانچہ آپ کو دنیا کی عظیم ترین جامعہ "آکسفورڈ یونیورسٹی" نے ڈی۔سی۔ایل کی ڈگری سے عزت بخشی اور ہماری ہر دلعزیز جامعہ عثمانیہ نے "امیر" کے عہدے سے سرفراز کرکے خود کو قریب تر کرلیا۔ ۱۹۱۷ء میں آپکی گہری تعلیمی دلچسپی کو دیکھتے ہوئے آپ کو معتمد تعلیمات مقرر کیا گیا۔ جوں ہی آپنے معتمدی کا حلف حاصل فرمایا اسی وقت سے آپ کی یہ دلی خواہش تھی کہ حیدرآباد کی اعلیٰ تعلیم کی بنیاد قومی اور روایاتی اصول پر رکھی جائے۔ آپ نے ملک کی ذہنیت، اختلاف قومیت و مذہب اور مقتضائے وقت کا غائر مطالعہ کیا اور ان خرابیوں کا مشاہدہ کیا جو عرصہ دراز سے غیر زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دینے سے پیدا ہوتی رہی ہیں۔ اس لئے آپ نے ایک معنی خیز نتیجہ نکالا اور وہ "جامعہ عثمانیہ" کا تخیل جس کا ذریعہ تعلیم اردو قرار دینا چاہا۔

تشکیل جامعہ عثمانیہ

۱۹۱۷ء کے شروع میں سر اکبر نے ایک نہایت مفصل اور مدلل معروضہ اعلیحضرت بندگانعالی کے حضور میں پیش کیا جس میں تعلیم کی موجودہ حالت پر نظر ڈالنے اور ان نقائص پر بحث کرنے کے بعد جو غیر زبان کے ذریعہ تعلیم دینے سے پیدا ہوتے ہیں ایک جدید یونیورسٹی کے قیام پر زور دیتے ہوئے یہ تجویز پیش کی۔

"موجودہ طریقۂ تعلیم اور بے اصولی کو مٹانے اور ان خطرناک اور تباہ کن نقائص کو رفع کرنے کے لئے جو موجودہ طریقۂ تعلیم نے پیدا کئے ہیں اور جو گھن کی طرح ہمارے نظام تمدن اور معاشرت قوائی دماغی اور جسمانی کو اندر ہی اندر کھائے جارہے ہیں۔ ہمیں ایک جدید یونیورسٹی کی ضرورت ہے جس کی بنیاد صحیح اصول تعلیم ملکی ضروریات اور قومی خصائص پر قائم ہو جس میں قدیم و جدید دونوں طرح کی خوبیوں

سے فائدہ اٹھایا جائے جو تعلیمی بھی ہو اور امتحانی بھی اور ساتھ ہی ساتھ تالیف و ترجمے کا کام بھی کرے اور ترتیب ذہن اور تحصیل علوم دونوں کے لئے اپنی ہی زبان یعنی اردو کو کام میں لائے۔

حضرت سلطان العلوم نے اس عرضداشت کو ملاحظہ فرمانے کے بعد فرمان نافذ فرمایا۔

"مجھے بھی عرضداشت اور یادداشت کے مصرصدائے سے اتفاق ہے کہ ممالک محروسہ کے لئے ایک ایسی یونیورسٹی قائم کیجائے جس میں قدیم و جدید، مشرقی و مغربی علوم و فنون کا امتزاج اس طور سے کیا جائے کہ موجودہ نظام تعلیم کے نقائص دور ہوکر جسمانی۔ دماغی اور روحانی تعلیم کے قدیم و جدید طریقوں کی خوبیوں سے پورا فائدہ حاصل ہو سکے۔

اس یونیورسٹی کا اصل اصول یہ ہونا چاہیے کہ اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ ہماری زبان اردو قرار دی جائے اور انگریزی زبان کی تعلیم بھی بہ حیثیت ایک زبان کے ہر ایک طالب علم پر لازمی گردانی جائے۔ لہذا میں بہت خوشی کے ساتھ اجازت دیتا ہوں کہ میری تخت نشینی کی یادگار میں حسب مذکور اصول محولہ عرضداشت کے موافق ممالک محروسہ کے لئے حیدرآباد میں یونیورسٹی قائم کرنے کی کارروائی شروع کیجائے۔ اس یونیورسٹی کا نام "عثمانیہ یونیورسٹی ہوگا"

یہ محض سراکبر کی مدبرانہ تجویز اور اعلیحضرت سلطان العلوم کی ہمت افزائی اور ذاتی دلچسپی تھی کہ حیدرآباد میں اتنا بڑا تجربہ شروع کیا گیا اور جامعہ عثمانیہ اور زبان "اردو" کی یہ خوش قسمتی ہے کہ ان کو پروان چڑھانے کے لئے سراکبر سا مدبر ملا۔

ابتدا میں سراکبر کو شدید رکاوٹوں اور مخالفتوں کا مقابلہ کرنا پڑا لیکن سراکبر اپنے غیر متزلزل اور اٹل ارادوں کے سامنے بھلا ان کو کب خاطر میں لاتے! چند دنوں کے بعد اس تجویز کا نہ صرف حیدرآباد بلکہ حیدرآباد کے باہر کے گوشے گوشے سے پرجوش خیر مقدم کیا گیا۔ چنانچہ سر رابندر ناتھ ٹیگور

بابو گیا پرشاد، پنڈت کیشوراؤ، پنڈت وامن چندر ناائک، پروفیسر تارا رائن گنیش ولنکر اور مسٹر ڈی اے اسمتھ کی پرزور اور پرخلوص تائیدیں اور مشورے اس تحریک کو کامیاب بنانے میں ممد و معاون ثابت ہوئے۔ ان قابل قدر ہستیوں کے مشورہ کا تذکرہ کرنا باعث طوالت ہوگا۔ اس لئے ہم صرف ڈاکٹر ٹیگور کی پرزور تائید اور خوشنودی کے اظہار کے اہم اقتباس پر اکتفا کرتے ہیں۔

"میں مدتوں سے اس دن کا انتظار کر رہا تھا جب کہ غیر ملکی زبان کے طوق و سلاسل سے آزاد ہو کر ہماری تعلیم بالطبع سب اہل ملک کے لئے سہل الحصول ہو جائیگی ..... مجھے یہ سن کر نہایت درجہ مسرت ہوئی کہ آپ کی ریاست ایک جامعہ قائم کرنے کی تجویز پر غور کر رہی ہے جس میں "اردو" ذریعہ تعلیم قرار دیجائے گی۔ یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ آپ کی تجویز کو میری کامل پسندیدگی حاصل ہے"

غرض کہ سر اکبر کی کوششوں کو بار آور بنانے میں ہر علم دوست نے حتی المقدور معاونت کی ماہ اگسٹ ۱۹۱۹ء میں جامعہ کی تعلیم کا آغاز کیا گیا۔ آپ کی تعلیمی گہری دلچسپی نے طبقۂ نسواں کو بھی سرچشمہ علم سے محروم نہیں رکھا بلکہ قیام جامعہ کے چند سال بعد اس کی تلافی اس طرح کیگئی کہ محبوبیہ زنانہ کالج اور کلیہ اناث جامعۂ عثمانیہ کے قیام کے اسکیم کو روبعمل لایا گیا۔ جس کے باعث طبقہ نسواں میں بھی علمی سرگرمی آئے دن ترقی پذیر ہے۔

دارالترجمہ کا قیام قیام جامعہ کے ایک ہی سال بعد ایجوکیشنل کانفرنس کی تحریک پر سر اکبر نے دارالترجمہ کی بنیاد رکھی تاکہ طلبہ مغربی علوم سے بھی تشنہ نہ رہیں۔ اس ادارے میں مختلف علوم کے ماہروں کو بحیثیت رکن دارالترجمہ مقرر کیا گیا۔ اس کے علاوہ ایک کمیٹی "وضع اصطلاحات علمیہ" قائم کیگئی جس نے آج تک تقریباً پچپن ہزار علمی اصطلاحات وضع کر کے علمی دنیا پر ناقابل فراموش احسان کیا ہے۔ دارالترجمہ نے ہر قسم کے علوم و فنون کی کتابیں شائع کیں اور اس کی تالیفات و تراجم علمی دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ بہرحال جامعۂ عثمانیہ اور دارالترجمہ کے قیام کا کارنامہ سر اکبر کے نہ مٹنے والے نقوش ہیں اور آپ کی معتمدی تعلیمات کا دور اپنے

اندر ایک زبردست انقلاب رکھتا ہے جس کو دکن کی تاریخ میں "سنہری حرفوں" سے لکھا جائیگا۔

حیدرآباد سیول سروس کی تاسیس

حیدرآباد سیول سروس کی ابتدا سر سالار جنگ اول جیسے مدبر کی رہین منت ہے لیکن اس نے عملی صورت ۱۸۸۴ء میں نواب عماد السلطنۃ سر سالار جنگ کے ہاتھوں اختیار کر لی تھی جو ۱۸۹۱ء تک مسلسل جاری رہی بعد ازاں چند وجوہ کی بنا پر اس کلاس کو برخاست کر دیا گیا۔ محکمہ مالگزاری کی اعلیٰ خدمات کے لئے ادنیٰ قابلیت کے لوگوں کا تقرر اس بات کا تقاضا کر رہا تھا کہ سیول سروس کو دوبارہ قائم کیا جائے چنانچہ سر اکبر کے جو اس وقت صدر محاسب تھے ۲۰ مئی ۱۹۰۸ء میں سر جارج کیمن واکر کی خواہش پر ایک نوٹ مرتب فرمایا جس میں یہ سفارش کیگئی تھی کہ انتخابی لیکن مسابقتی اصول پر ایک منظم سیول سروس کے امتحان کا آغاز فرمایا جائے۔ چنانچہ سر جارج نے اس سفارش کو قبول فرمایا۔ ۱۹۱۰ء میں سٹیولین کی بڑھتی ہوئی تعداد کو دیکھ کر دوبارہ کلاس کی جانب سے سر اکبر کو "حیدر نواز جنگ" کی خطاب یابی کی مسرت میں فروری ۱۹۲۳ء میں بمقام نظام کالج ایک پرتکلف عصرانہ دیا گیا۔ اس موقعہ پر اراکین نے سر اکبر سے خواہش کی کہ سیول سروس کی کلاس کو دوبارہ قائم کیا جائے۔ آپ نے انکی خواہش پر دستور اضلاع اور دفاتر معتمدین میں اشتراک عمل پیدا کرنے کے لئے دوبارہ کلاس قائم کرانے کی تجویز فرمائی۔ اس تجویز کے بعد حیدرآباد سیول سروس کلاس آج تک قائم ہے جو سر اکبر کی مدبرانہ کوشش کا نتیجہ ہے۔ اور یہ کوشش قیام سیول سروس تک یادگار رہے گی۔

صنعت و حرفت سے سر اکبر کی دلچسپی

مسٹر ولکفیلڈ ناظم صنعت و حرفت کی رخصت کے سلسلے میں سر اکبر کو نگرانکار مقرر کیا گیا تھا جہاں آپ نے قلیل عرصہ میں متعدد قسم کی نئی نئی باتیں پیدا کیں جو ملک کے لئے اکثر مفید ثابت ہوئیں۔ مثلاً پہلے یہ کہ روغن برادی کے دستی گھنوں کی توسیع و تعلیم میں زیادہ دلچسپی لی اس کے بعد سمنٹ کے کارخانے کے ابتدائی مراحل طے کئے اور کاغذ سازی کی مردہ صنعت میں جان ڈالدی۔ اسی زمانہ میں جب عثمان شاہی ملز کا دیوالیہ ہو رہا تھا تو آپ نے اپنے تدبر سے گورنمنٹ ٹرسٹ فنڈ کے تحت کارخانے

کو جاری رکھا۔ اور سب سے اہم کام یہ کہ پیائش طبقات الارض کی ضرورت بتلائی کہ ملک کی معدنیات سے گورنمنٹ حیدرآباد کو مستفید ہونے کا موقعہ مل سکے متذکرہ بالا امور بظاہر معمولی معلوم ہوتے ہیں لیکن اس کی اہمیت کا اندازہ وہی کر سکتے ہیں جنھوں نے اس میدان میں عملی اقدام کیا ہو۔ یہ سراکبری کے حسن تدبر اور غیر معمولی قابلیت کا کرشمہ تھا کہ بہت سے مفید امور تھوڑی سی مدت میں ظہور پذیر ہوئے۔

گول میز کانفرنس اور سراکبر گول میز کانفرنس کی شرکت میں سراکبر ایک کامیاب مدبر کی حیثیت سے نظر آتے ہیں اسی لئے حکیم السیاست اعلیحضرت بندگانعالی ہر موقعہ پر حیدرآبادی وفد کی صدارت کے لئے سراکبری کا انتخاب فرمایا کرتے۔ سراکبر نے جس حسن وخوبی، احتیاط پسندی اور دوربینی سے حیدرآباد کی نمائندگی کی وہ اپنی جگہ بے مثل ہے۔ آپ نے کانفرنسوں کے اجلاسوں میں حکیم السیاست اعلیحضرت بندگانعالی کی صحیح ترجمانی کی اور حیدرآباد کے حقوق کی حفاظت کے لئے ایک مجاہد کی طرح لڑا کئے چنانچہ سرسیمول ہور نے سراکبر کی صحیح نمائندگی کے اعتراف میں فرمایا تھا کہ

"جب دنیا کسی وجہ سے دولت کھو رہی ہے سراکبر حیدری دولت پیدا کرنے میں کامیاب رہے"۔

گول میز کانفرنسوں کی نشستوں میں سراکبر نے جو نمایاں کام کئے لارڈ ملنگٹن نے اپنی نشستوں میں ایک جلسے کی صدارت کرتے ہوئے سراکبر کی نکتہ سنجی، معاملہ فہمی اور مدبر ہونے کا اعتراف ان الفاظ میں کیا۔

"..... حیدرآباد کی تنظیم مالیہ، نظم ونسق کی کامیابی اور تمام مادی ترقیوں میں سراکبر حیدری کی گہری دلچسپی شریک رہی ہے اور ہر اصلاحی اور ترقی پذیر کام میں سراکبر حیدری کا نمایاں حصہ رہا ہے"۔

علاقہ رزیڈنسی کی واپسی علاقہ رزیڈنسی تقریباً سو سال سے سرکار برطانیہ کے تصرف میں تھا اور وہ اس علاقہ میں بالکل خود مختارانہ طرز عمل سے کام لیا کرتے تھے جس سے حیدرآباد کی یہ دو عملی ایک عجوبہ معلوم ہوتی تھی۔ سراکبر جیسے مدبر اور معاملہ فہم کو اس قسم کی دو عملی کس طرح پسند آتی؟ آپ نے اپنی ہمہ گیر

صلاحیتوں کے ساتھ اس علاقے کو ریاست حیدرآباد سے وابستہ کرنیکی جد وجہد کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علاقہ ریذیڈنسی بتاریخ ۱۴ مئی ۱۹۳۳ء کو چند باہمی معاہدات کی بنا پر از سر نو علاقہ سرکار عالی قرار دیا گیا سر اکبر کا یہ کارنامہ دور عثمانی کا درخشاں کارنامہ ہے جس کو آنے والی نسلیں شاندار تاریخی یادگار تصور کرینگی۔

استرداد برار اور سر اکبر کی جد و جہد اعلیٰ حضرت بندگانعالی نے اپنی تخت نشینی کے بعد ہی سے استرداد برار کی کارروائی کا آغاز فرمایا تھا لیکن چند ناگزیر وجوہ کی بنا پر حضور نے اس کام کو سر اکبر کے سپرد فرمایا۔ اس کے بعد سر اکبر نے سر سیموئیل ہور سے اس معاملہ میں گفتگو کی۔ اس کا جواب سر سیموئیل ہور نے ان الفاظ میں دیا۔

"... ہمیں ایک یا دو مسئلوں سے سابقہ پڑا مثلاً ایک برار کے مستقبل سے متعلق تھا برار کا ملک حیدرآباد کا ایک حصہ ہے لیکن اس کا انتظام برطانوی حکومت کرتی ہے۔ ...

... سر اکبر اور میں نے اس مسئلے پر کسی قدر تفصیلی بحث کی ہے اور میں ان مباحثوں کی بنا پر یہ کہنے کی جرارت کرتا ہوں کہ جانبین میں نیک نیتی موجود ہے۔

نومبر ۱۹۳۳ء کے اواخر میں لارڈ ولنگڈن سابق وائسرے ہند حیدرآباد تشریف لائے تو سر اکبر نے برار کے متعلق گفت و شنید کی۔ ہز اکسلنسی نے اسٹیٹ بنکوٹ کے موقع پر اپنی تقریر میں اطمینان ظاہر فرمایا جس کی بنا پر ۲۴ اکتوبر ۱۹۳۶ء میں معاہدہ برار پر دستخط ہو گئے۔ اس معاہدہ برار میں سر اکبر نے مدبرانہ کارگذاری دکھائی ہے اور جس حکمت عملی سے کام کیا ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ بہرکیف ۱۹۳۶ء میں جس چیز کا کلیتہ انکار کر دیا گیا تھا ۱۹۳۶ء میں سر اکبر کی کوششوں سے اس کو ایک حد تک قبول کر لیا گیا۔

وفاق اور سر اکبر ہندوستان کے لئے وفاقی حکومت کی تشکیل کے متعلق جو بحث و مباحث ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۷ء تک ہوتے رہے ان میں سر اکبر کا بیشتر حصہ ہے حکیم السیاست اعلیٰ حضرت بندگانعالی نے آپکے حسن تدبر اور غیر معمولی قابلیت کو دیکھتے ہوئے سر اکبر کو وفد حیدرآباد کے صدر کی حیثیت سے انگلستان روانہ فرمایا جہاں پر آپنے گول میز کانفرنس کے مختلف جلسوں میں وفاقی حکومت کی

کی پرزور تائید کی کیونکہ آپ تمام ہندوستانی ریاستوں کو ایک مرکز پر متحد دیکھنا چاہتے تھے جیسا کہ سر اکبر کے متعدد بیانوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کا مقصد ایک ایسے جدید اور وسیع ہندوستان کی تشکیل میں مدد دینا تھا جو ہندو تہذیب کے تحفظ اور بقا کے لئے کوئی خطرہ نہ بن سکے ایوان روسا کے چانسلر ہز ہائنس جام صاحب نوانگر نے چند ماہ قبل ایک ظہرانہ میں تقریر فرماتے ہوئے بالکل صحیح فرمایا تھا کہ سر اکبر ان لوگوں میں سے ایک ہیں جنھوں نے سب سے پہلے اس بات کو محسوس کیا کہ ہندوستان کے موجودہ انقلابی اور عبوری دور میں ہندوستانی ریاستوں کا متحد الخیال ہو کر ایک متحدہ محاذ پر مستحکم ہو جانا کس قدر ضروری ہے لیکن سر اکبر نے بہت جلد محسوس کیا کہ ہندوستان کے تحفظ و وقار کے لئے وہ اپنے قدیم روایات، معطیہ ضمانتوں اور معاہدات پر قائم رہ کر مادر وطن کی منظم ترقی میں خاطر خواہ مدد دے سکتے ہیں لیکن وفاقی دستور کے لحاظ سے ریاستوں کو اپنے قدیم روایات اور معاہدات سے دستبردار ہونا پڑتا ہے مثلاً ٹپہ، ٹیلیگراف، ٹیلیفون، سکہ قرطاس محصول کروڑگری محصول آبکاری غرض کہ وفاقی فہرست کے جملہ ۶۴ مدات میں سے آٹھ ۸ مدات کی دیسی ریاستوں کو پابندی کرنا لازمی ہوگی۔ اس لئے آپنے ریاست حیدرآباد کی شرکت وفاق پر غور کیا تو یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ریاست حیدرآباد کی قدیم روایات اور معاہدات کچھ اس قسم کے ہیں کہ وہ کسی حالت میں اس سے دستبردار نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ اس مسئلہ کو سلجھانے کے لئے کہ آیا وفاق میں شرکت کیجائے یا نہ کیجائے "حیدری کمیٹی" کی تشکیل دی گئی جس میں سر اکبر کو صدر مقرر کیا گیا۔ اس کمیٹی نے سر اکبر کی دور اندیشی سے کام لے کر بہت سی مفید سفارشیں گذرانیں۔ سر اکبر نے بذات خود گول میز کانفرنس میں وفد حیدرآباد کے صدر کی حیثیت سے بطور خاص اس امر کو واضح کر دیا کہ وفاقیہ کی صورت میں بھی مملکت حیدرآباد اپنی فرمانروائی کی علامتیں بدستور قائم رکھے گی مثلاً ٹپہ، سکہ، ٹیلیگراف، محصول کروڑگری وغیرہ۔

غرض مجوزہ وفاق میں حیدرآباد کے معاہدات کی حفاظت کرنے کے لئے سر اکبر نے جو تدبر برتا ان کے تفصیلات کو ظاہر کرنے کا جب کوئی مناسب وقت آئیگا تو ان کے نکتہ چین یہ معلوم کر کے حیران رہ جائینگے کہ کسی نے بھی اتنی قوت صرف نہیں کی۔ سر اکبر ایک لمحے کیلئے

بھی اپنے اس عقیدے سے روگرداں نہیں ہوئے کہ ہندوستان کے دستوری ارتقا میں ریاستوں کے مفادات بالخصوص حیدرآباد کے معاہدات کی حفاظت ایک شرط اول ہے جس کے بغیر ہندوستان کی سیاسی وحدت کبھی کامل اور مضبوط نہیں ہوسکتی۔

ریلوے کی خریدی

دی نظام اسٹیٹ ریلوے کا نام دی نظام گیارنٹیڈ ریلوے تھا جس کا انتظام ایک انگریزی کمپنی کے ہاتھ میں تھا سرکار نظام اور نظام گیارنٹیڈ اسٹیٹ ریلوے کمپنی کے درمیان جو معاہدہ تھا اس کی رو سے ۱۹۳۳ء کے ختم تک ریلوے کے جملہ علاقوں پر کمپنی ہی کو اقتدار حاصل تھا اور سرکار نظام اس میں دخل دینے کی مجاز نہ تھی لیکن بعض اندرونی معاشی مسائل اور بعض حوادث موقوعہ حدود ریلوے اس بات کے مقتضی تھے کہ کوئی تدبیر ایسی نکالی جائے کہ معاہدہ کی مدت اختتام سے پہلے کمپنی ریلوے کی ملکیت سے دستبردار ہوکافی غور وخوض کے بعد حضرت اقدس واعلیٰ کی ہدایت پر سر اکبر نے اپنی دانشمندی اور تدبر سے ضروری دستاویزات بیع وشری کی تکمیل حسب ضابطہ ۸ مارچ ۱۹۳۰ء کو ریلوے بورڈ واقع لندن سے کرائی۔ اس جدید معاہدہ کی بناء پر یکم اپریل ۱۹۳۰ء سے ریلوے سرکار عالی کی ملکیت میں آگئی۔ اس خریدی میں سرکار عالی کا فائدہ اور رعایا کی فلاح وبہبود کی دونوں باتیں مضمر تھیں جیسا کہ سر اکبر کے نوٹ کے اہم اقتباس سے واضح ہے۔

"ایک منفعت بخش صنعتی کاروبار کو خرید لینے سے سرکار عالی کو یہ جو فائدہ ظاہر کیا گیا اس کو دوسرے طریقے پر بھی ظاہر کیا جاسکتا ہے یعنی یہ کہ اس میں تقریباً (۹۵۰۰۰۰) پونڈ سالانہ کا اضافہ ہوگا یعنی (۱۲۷۵۰۰۰) پونڈ کے صرفے پر جس کی خریداری ریلوے کے لئے ضروری ہے تقریباً ۱۳ فیصد منافعہ سرکار عالی کو حاصل ہوگا بالفاظ دیگر موجودہ محاصل ریلوے کے مقابل تقریباً ایک کروڑ سکہ عثمانیہ کا سالانہ اضافہ ہوگا ... یہ امور بھی سرکار عالی کے پیہم پیش نظر رہے ہیں کہ اس سے حکومت سرکار عالی عام رعایا اور عامۂ مسافرین وتجارت پیشہ اشخاص کے حقوق کی دیکھ بھال کر سکیگی"

سر اکبر نے ریلوے کو خرید کر جو مہتم بالشان کارنامہ پیش کیا ہے ہمارے دلوں میں ان کے تدبر اور وسعت نظری کے نقوش دائمی طور پر باقی رہیں گے۔

صدارت عظمیٰ

مہاراجہ یمین السلطنت سرکشن پرشاد بہادر نے اپنے تقاضائے عمر کی بناء پر صدارت عظمیٰ سے سبکدوشی کی نسبت بارگاہ خسروی میں ایک عرضداشت گذرانی جس کو شرف منظوری بخشا گیا۔ حکیم السیاست

حضرت اقدس اعلیٰ نے اپنے حکومت کے نظم ونسق کی اصلاحی تجاویز پر غائرانہ نظر ڈالتے ہوئے شاہانہ رائے ظاہر فرمائی

"چونکہ اراکین کونسل میں اس وقت سر اکبر حیدر نواز جنگ سنیر ممبر ہیں اور انہوں نے اب تک جو خدمات ملک و ملک کے بجالائے ہیں وہ قابل قدر ہیں لہذا اس کے مدنظر ان کو پانچ سال کے لئے کونسل کا پریسیڈنٹ مقرر کرتا ہوں"

۱۹۳۷ء کا مسعود سال یادگار رہیگا جب اس ہستی کو جس نے صدر محاسبی سے مسلسل اپنی مدبرانہ کوششوں اور اعلیٰ صلاحیتوں کو ملک کے اہم سیاسی معاشی، تمدنی اور مذہبی وسائل پر بے دریغ صرف کیا ہے۔ صدارت عظمیٰ کے عہدے سے سرفراز فرمایا جانا

دستوری اصلاحات

برطانوی ہند کی آئینی ترقی اور نئے نئے سیاسی رجحانات سے دیسی ریاستیں شدت کے ساتھ متاثر ہوئی تھیں حیدرآباد بھی جو سر اکبر کی مدبرانہ کوششوں سے ترقی پسندی اور روشن خیالی کا حامل رہا ہے متاثر ہوئے بغیر کیونکر رہ سکتا؟ ایک عام مشاہدہ ہے کہ جب کسی ملک میں دستوری انقلاب رونما ہوتا ہے تو داخلی کیفیات کے زیر اثر مختلف تبدیلیاں ظہور پذیر ہوتی ہیں چنانچہ حیدرآباد میں جب اصلاحاتی مسائل پر توجہ کیجانے لگی اور حکومت کی جانب سے اصلاحات کے مسئلہ پر غور کرنے کیلئے اینگار کمیٹی کا قیام عمل میں آیا تاکہ وہ کامل تحقیق کے بعد اصلاحات کے متعلق اپنی سفارش حکومت کے آگے پیش کرے) تو ملک کے ایک طبقہ نے دستوری تبدیلی اور اصلاحات کے اتوار کا مطالبہ کیا۔ اس عمل اور ردعمل نے ملک میں ایک ہیجانی کیفیت پیدا کردی۔ اسٹیٹ کانگریس کی جانب سے ستیاگرہ کا آغاز اور پھر ستیاگرہ کے سلسلہ میں اور دو فرقہ وارانہ محاذوں کا قیام خود اس امر کی روشن دلیل تھی کہ شدید قسم کی فرقہ واریت پیدا کرنا حکومت کے خلاف شورش و فساد کرنا اور ملک کے امن و امان کو تباہ کرنا ہے۔ حالانکہ سر اکبر اینگار کمیٹی کے تجاویز پر عمل کرنے کے پابند نہ تھے جیسا کہ انہوں نے ۲۲ ستمبر ۱۹۳۷ء کو مجلس وضع قوانین کے یادگار اجلاس میں واضح طور پر بیان فرمایا کہ "حکومت سرکار عالی قبل از قبل اپنے کو اس (اینگار کمیٹی) کی تجاویز کے قبول کرنے کے متعلق پابند نہیں کرسکتی لیکن اس پر ہمدردانہ غور کرسکتی ہے" اس کے علاوہ آپنے دستوری اصلاحات میں پیشہ ورانہ نمایندگی کا جو تصور پیش کیا تھا وہ باہمی افتراق کو دور کرنے اور یگانگت پیدا کرنے کے لئے بہت کافی تھا مگر سیاسی شعور اور جماعتی ذہنیت کے فقدان کے باعث اسکی افادیت اور حقیقت سے قطع نظر کرکے ایسے طریقے اختیار کئے جانے لگے جو نہ صرف غیر ضروری تھے بلکہ اپنے اندر مضر اثرات بھی رکھتے تھے بالآخر ذہنی کشمکش، جماعتی انتشار، اور فرقہ واری کے اس شدید طوفان میں ۱۲ شہریور ۱۳۴۶ف

کو حکومت کی جانب سے کافی حزم و احتیاط کے ساتھ دستوری اصلاحات کا اعلان کیا گیا جس میں سر اکبر کے تدبر نے نقرہ ہر الجھن پر فتح پائی اور اقلیت و اکثریت کے حقوق و مفاد کے تحفظ و بقا پر قابو پایا اور نیز صلح و آشتی کی دعوت دی مگر جیسی کہ توقع کی جارہی تھی تو اس اعلان کی آواز اپنی ہی گونج میں فنا ہو کر رہ گئی ملک کے کسی طبقہ نے اس خیر مقدم نہیں کیا اور ملک کے کسی گوشے میں بھی اس کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا گیا۔ مختلف جماعتوں نے اپنے خطوط پر اس کے خلاف محاذ قائم کر رکھا اور لیڈران قوم اپنے اپنے زاویۂ نگاہ سے اس کے خلاف اپنی اپنی جماعتوں کی رہنمائی کرتے رہے مثلاً ہندو قائدین نے ایک عجیب و غریب بات کہی کہ

"مملکت کی اقلیت کو اکثریت کا ہم پلہ بنا دیا گیا اور معلوم ہوتا ہے کہ اقلیت نے اپنی دستوری اکثریت حاصل کر لی ہے"

اسی طرح مسلمان قائدین کی جانب سے یہ آواز آئی کہ "مقننہ اور ادارہ جات مقامی حکومت خود اختیاری کی ترکیب میں بہر حیثیت مسلمان کو آئینی اکثریت حاصل رہے۔ مسلم نشستیں جداگانہ انتخاب کے ذریعہ پر کی جائیں"

اور کسی نے یہ طفلانہ نعرہ لگایا کہ "ہمارے حقوق پر دست درازی ہو رہی ہے"

غرض کہ سر اکبر کی صدارت عظمیٰ کا دور گوناگوں تغیرات کا آماجگاہ بنا ملک کے مختلف طبقوں نے حیدرآباد کی پرسکون سیاسیات میں بڑا مد و جزر پیدا کر دیا۔ اور اس کی بڑی وجہ چند ایسے لوگوں کا سر اکبر کے ہاں ریاست حاصل کرنا تھا جو صحیح معنی میں اعتماد کے لائق نہ تھے یہ تلخ ظریفی ہماری سیاسی تاریخ کے صفحات پر یاد رہے گی کہ حالات کے تقاضوں کا لحاظ کرتے ہوئے کسی نے بھی مسائل پر دانشمندی، معاملہ فہمی اور اعتدال پسندی کے نقطۂ نظر سے غور نہیں کیا پس عملی پروگرام ہی ہو سکتا ہے کہ ہر دو اقوام کو چاہیئے کہ اصلاحات کے سلسلہ میں حکومت سے تعاون کریں کہ مخالفت جو نہ صرف غیر دانشمندانہ فعل ہے بلکہ روایات ملک کے بھی منافی ہے۔

اعلان اصلاحات اس دور کا زریں کارنامہ ہے جو ہمیشہ سر اکبر کے نام اور انکی مدبرانہ جد و جہد کو حیات جاوید بخشیگا حیدرآباد جہاں سر اکبر کے تدبر کے باعث سارے ہندوستان میں ممتاز رہا وہاں بطور حکومت مجوزہ اصلاحات کو کامیاب بنا کر ملاقوی ہند کے لئے قابل تقلید بھی بنایا جا سکتا ہے۔

حیدرآباد کی خدمات جلیلہ سے سبکدوشی

۱۲ جولائی ۱۹۴۱ء کے ایک سرکاری بیان بحیثیت کونسلر و ایسوسی ایٹ کی انتظامی

کونسل کی توسیع اور ایک قومی مدافعتی کونسل کے تقرر کا اعلان کیا گیا۔ جس پر ہز مجسٹی ملک معظم نے پانچ نئی نشستوں کی منظوری عطا فرمائی۔ اس موقعہ پر ہز اکسلنسی وائسرائے ہند نے سر اکبر کی غیر معمولی قابلیت اور تدبر کو دیکھتے ہوئے بحیثیت رکن معلومات انتخاب فرما کر اپنی جوہر شناسی کا جو ثبوت دیا وہ تاریخ کا ایک بیش بہا ورق ہوگا۔ اس طرح سر اکبر ۲۲ مہر ۱۳۵۰ف کو یعنی ۴۸ سال کی دیرینہ خدمات جلیلہ سے سبکدوش ہوئے۔ اپنی عمر کا بہترین حصہ ملک و مالک کی خدمت میں بسر کرنے کے بعد مزید اعزازات کے ساتھ حیدرآباد سے اس طرح رخصت ہونا ایک شاندار واقعہ ہے سر اکبر کی خدمات جلیلہ کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ خود اعلیحضرت بندگانعالی نے ان کے لئے "ملکی" کا لفظ استعمال فرمایا جس کے بعد حیدرآباد کے ساتھ سر اکبر کا نام اس طرح وابستہ ہوگیا ہے کہ دونوں کو علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔

افسوس کہ سر اکبر نے حیدرآباد سے رخصت ہونے کے دو تین ماہ بعد ہی فرشتۂ اجل کو لبیک کہا۔ جس کی وجہ سے ہندوستان کی سیاسی قیادت کی صف میں جو جگہ خالی ہوگئی اس کے پُر ہونے میں مدت درکار ہوگی۔ "ہندوستان نے اپنی بساط سیاست کا ایک اہم مہرہ کھو دیا" سر اکبر ان "دیدہ ور" انسانوں میں سے تھے جو "بڑی مشکل سے پیدا ہوتے ہیں"

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

ماخذ :- (۱) عصر جدید (۲) کارنامۂ حیدری (۳) وفاق ہند (۴) دی گریٹ مین آف انڈیا (۵) اخبارات پیام، رہبر دکن، صبح دکن (۶) حیدرآباد اور آئینی اصلاحات (۷) منظر الکلام

محمد مصلح الدین صدیقی
متعلم سال دوم

حیدری

صورت مہر مبیں روشن ہے نام حیدری
آج عالم پر عیاں ہے انتظام حیدری

حق یہ ہے تدبیر و حکمت ختم ان پر ہو گئی
دوسرا ممکن نہیں قائم مقام حیدری

گل قدح بر کف اگر ہے تو ہے لالہ خم بدوش
پی رہے ہیں آج سب گلشن میں جام حیدری

جامعہ۔ تالیف۔ سڑکیں۔ ریلوے موٹر بسیں
ہے نمایاں سب سے حسن انتظام حیدری

دیدۂ انصاف سے دیکھیں اگر اہل جہاں
عرش سے اونچا نظر آئیگا بام حیدری

حیدر صفدر کے نام پاک سے منسوب ہے
قابل تعظیم ہے اے چرخ نام حیدری

حیدر کرار اب آساں کریں گے مشکلیں
صبح کو اٹھتا ہوں عصمت لے کے نام حیدری

مرزا عصمت اللہ بیگ
پروس ڈپارٹمنٹ۔ جامعہ عثمانیہ

لیڈی حیدری

خاندانی حالات

امنہ خاتون (لیڈی حیدری) اس معروف اور ممتاز خاندان کی رکن تھیں۔ جو ہندوستان میں طیب جی خاندان کے نام سے مشہور ہے۔ اس خاندان میں بہت سے نامور لوگ ہوئے ہیں۔ بمبئی کے ممتاز چیف جسٹس بدرالدین طیب جی اسی خاندان کے سپوت تھے۔ ان کے بھائی نجم الدین طیب جی بھی ایک سربرآوردہ رکن تصور کئے جاتے ہیں۔ کالی کٹ میں ان کا بڑا کاروبار تھا۔ اور وینا ڈ میں کافی زمینات تھیں نجم الدین طیب جی تاجر ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد سنجیدہ عالم اور علم دوست تھے علم اور مذہب کے دیوانے تھے۔ چنانچہ اسی شوق اور قلبی تاثرات کے باعث وہ عربستان گئے تاکہ حضرت سیدنا صاحب سے جو ملک عرب کے ایک باوقار بزرگ اور بحرین کے شیخ تھے۔ نیاز حاصل کریں۔ اور اس گنجینۂ علم و فضل سے کچھ فیض اٹھائیں خوش قسمتی سے یہاں ان کی شادی حضرت سیدنا صاحب کے خاندان کی ایک لڑکی بی بی مریم خاتون سے ہوئی۔ یہ خاتون نہایت ہی لایق روشن خیال اور سنجیدہ اور فیاض تھیں۔ ہندوستان جب آئیں تو ان کے لئے یہ دنیا بالکل نئی تھی کیوں کہ ماحول نیا لوگ نئے زبان نئی۔ غرض ایک بھی چیز ایسی نہ تھی جو ان کی طبیعت کے مناسب ہو لیکن انھوں نے اپنی فراست و دانائی سے اپنے کو ہندوستانی ماحول میں کچھ اس طرح سمو لیا کہ اجنبیت کا شائبہ تک باقی نہ رہا۔ اس کے علاوہ چند ہی دنوں میں اپنے مخصوص برتاؤ ملنساری اور مہمان نوازی سے خویش اقارب دوست احباب اور ملنے جلنے والوں کا دل اس طرح موہ لیا کہ سب ان کے دیوانے ہو گئے۔ اسی نیک بخت اور فریس خاتون کے بطن سے ۱۸۷۸ء میں امنہ خاتون کالی کٹ گلاسن بلڈنگ میں پیدا ہوئیں جو وہاں کی فرانسیسی حکومت کی یادگار عمارت ہے اس طرح سے امنہ خاتون خاندانی اعتبار سے دو ممتاز خصوصیتوں کی مالک تھیں۔ ایک تو ننھیال کی طرف سے

عربی النسل تھیں۔ اور عرب کے ایک شریف اور خالص مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ اور دوسری طرف ان کا جدی تعلق ہندوستان کے ایک باعزت خاندان سے تھا جو اپنی دو خصوصیتوں کے باعث ہندوستان بھر میں مشہور تھا۔ ایک تو یہ کہ "اس خاندان کا ہر فرد ایک زمانہ سے کسی نہ کسی شہرت کا مالک رہا ہے۔" اور دوسرے "اس خاندان کی خواتین مسلمانوں میں سب سے پہلے نئی روشنی قبول کرنے والوں میں سے تھیں اور اس کے مرد ہمیشہ ترقی کے حامی رہے ہیں"۔

بچپن امنہ خاتون بچپن ہی سے بڑی ہوشیار اور ذکی الطبع تھیں۔ بچپن ہی سے وہ گھر کا کاروبار کرتی تھیں پڑھنے لکھنے میں دلچسپی لیتی تھیں۔ بزرگوں کی عزت کرتی تھیں۔ ہر ایک سے ملتے جلتے میں ان کے مراتب کا خیال رکھتی تھیں۔ اور ہم عمر بچیوں کو کھیل کود اور دوسرے معاملات میں صلاح مشورے دیا کرتی تھیں۔ ان کی باتوں سے والدین متاثر تھے۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ یہ ہونہار لڑکی ایک نہ ایک دن ہندوستان میں نام پیدا کرکے رہے گی۔ اسی لئے وہ اپنے ماں باپ کی آنکھوں کا تارہ بنکر رہی۔

امنہ خاتون کے بچپن کا ایک واقعہ بڑا دلچسپ ہے۔ ان کی عمر جب آٹھ سال کی تھی تو یکایک صحت خراب ہوگئی بہتیرا علاج کروایا لیکن کچھ نمایاں فائدہ نہ ہوا۔ اس پر ان کی بہن صفیہ خاتون انھیں اپنے ساتھ کراچی لے گئیں تاکہ تبدیل آب و ہوا سے صحت ٹھیک ہوجائے۔ وہاں ایک خدارس بزرگ سے ان کا علاج بھی کروایا جس سے شفا ہوگئی ایک دن شام کو وہ بالاخانہ کی چھت پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ کہ سڑک پر سے چھم چھم کی آواز سنائی دی دیکھا کہ ایک حسین و جمیل عورت زیورات سے لدی ہوئی خوشنما پوشاک پہنے اور ہاتھ میں چوک لئے چھم چھم کرتی سڑک پر سے جارہی ہے۔ ڈرتے ڈرتے انھوں نے اپنی بڑی بہن کو آواز دی اور پھر جو پلٹ کر دیکھتی ہیں تو وہ صورت غائب۔ رہے سہے اوسان بھی خطا ہوگئے اتنے میں بڑی بہن آگئیں انسے سارا حال کہا۔ بہن نے دلاسا دیا اور کہا کہ ایسی باتوں سے ڈرنا نہیں چاہیئے۔ اس واقعہ سے وہ بہت متاثر تھیں اور آخر عمر تک کبھی کبھی بڑے مزے سے دھراتی اور کہتی تھیں۔

"میں نے بچپن ہی میں لچھمی کو دیکھا تھا"۔

تعلیم و تربیت

امنہ خاتون کی ابتدائی تعلیم و تربیت زیادہ تر گھر ہی پر ہوئی اور انھوں نے بہت تھوڑے عرصے میں منشی امیر علی لکھنوی سے کلام مجید ختم کرلیا۔ اردو اور عربی۔ اردو اور فارسی پڑھنے لگیں۔ اردو زبان اور اردو شعر و سخن سے انھیں کافی دلچسپی تھی چنانچہ اس زمانہ میں انھیں مسدس حالی پورے کا پورا حفظ تھا۔ اور اسے وہ بے تکلف بچوں کو پڑھ کر سناتی تھیں۔

شادی سے کچھ دن پہلے وہ کانونٹ اسکول میں شریک ہو کر انگریزی تعلیم پانے لگیں۔ اس وقت انھیں کچھ ایسی زیادہ انگریزی نہ آتی تھی۔ کیونکہ انھوں نے صرف انگریزی کے چار کتابیں ختم کی تھیں۔ بعد میں انھوں نے اس زبان میں کافی دستگاہ حاصل کرلی۔ امنہ خاتون کی اعلیٰ تربیت میں ان کے والدین گھر کے ترقی یافتہ اور روشن ماحول کا زیادہ حصہ ہے۔ اس ماحول کی اثر افرینی نے اس نوخیز پودے کو اپنے روایتی کلچر سے اس درجہ مستفید کیا کہ بڑی ہو کر وہ نہ صرف اپنی خاندانی روایت کو برقرار رکھ سکیں بلکہ سروجنی نائیڈو کے الفاظ میں "نسوانیت کا کنول اور عورتوں کی بے تاج شہزادی" بنکر رہیں۔

شادی سے پہلے امنہ خاتون زیادہ تر گھر کے کام کاج اور انتظام میں مصروف رہا کرتی تھیں۔ اس زمانہ میں وہ سماجی کاروبار میں حصہ نہ لے سکیں۔ البتہ اپنے مستقبل کو درخشاں بنانے کے وسائل تلاش کرتی رہیں لیکن جب ۱۸۹۳ء میں وہ ہندوستان کے مشہور و معروف صاحب مالیہ اور سماجی اور تعلیمی مصلح کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوگئیں۔ تو شوہر کی اعلیٰ علمیت اور روشن خیالی کے باعث ان کے ذاتی شغف اور فطری رجحان کو نشو و نما پانے کا موقع ملا۔ اور وہ سماجی اصلاح کی جد و جہد میں حصہ لے سکیں۔

رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری نے جب اپنی رفیق حیات میں توانائی اور کارکردگی کا ایک بیش بہا خزانہ پایا۔ تو ان مخفی قوتوں کو پروان چڑھانے کی ٹھان لی اور نہایت ہی دلچسپی کے ساتھ ایسے مواقع فراہم کئے کہ ان کا علمی معیار بڑھے اور وہ ہندوستان کی نامور خاتون ثابت ہوں۔ سب سے پہلے پہلے ان کی اعلیٰ تعلیم کی طرف توجہ کی گئی اور انگریزی ادب۔ تاریخ۔ معاشیات۔ جیسے مفید علوم سے واقف کرایا گیا۔ اور پھر مشہور مصنفین رسکن کارلائل۔ برک براؤننگ۔ بیکن اسپنسر۔ ویلز کے کارناموں سے روشناس کرایا گیا۔ چنانچہ جب وہ سر اکبر کے ساتھ انگلستان گئیں۔ تو وہاں انھیں ریمزے۔ میکڈانلڈ۔ لارڈ لوتھیان۔ سر سیموئیل ہور۔ لارڈ سانکے جیسی معروف

ہستیوں سے بھی ملنے جلنے اور تبادلہ خیال کا موقع ملا۔

اولاد لیڈی امنہ حیدری کے چھ بچے ہیں۔ سب سے بڑے۔ صالح حیدری ہیں جو اس وقت وائسرائے کونسل میں ہیں۔ صالح حیدری کے بعد دو لڑکیاں ہوئیں۔ ایک مریم خاتون ہیں۔ جو حاتم طیب جی سے منسوب ہیں۔ اور دوسری نجم خاتون جو قمر طیب جی کی رفیق حیات ہیں۔ ان کے بعد انھیں تین لڑکے ہوئے۔ علی حیدری۔ اقبال حیدری اور محمود حیدری۔ ان سب بچوں کی تعلیم و تربیت کلیتہً ماں کی نگرانی میں ہوئی اور آج سماج میں جو ان کا رتبہ ہے وہ اسی شفیق ماں کی محنتوں کا نتیجہ ہے۔

گھر کے اندر لیڈی حیدری کی گھر کی زندگی کا پہلو بہت ہی درخشاں ہے۔ جس طرح انھوں نے ایک ہمدرد اور باوقار خاتون کی طرح ملک و قوم کی شائستہ خدمات کو اپنا شعار بنا لیا تھا اسی طرح انکی خانگی زندگی حقیقی معنوں میں ایک مشرقی خاتون کی مثالی زندگی کا مکمل نمونہ تھی۔ آج کل کی تعلیم یافتہ اور دولت مند خواتین کی طرح وہ ایسی مہیم صاحبہ نہ تھیں جس کی زندگی ملازمین کی رہین منت ہو یا جس کا وجود شوہر کے لئے ایک کانٹا ہو یا جس کے بچے آیاؤں اور انّاؤں کی گود میں پلتے ہوں۔ بلکہ وہ ایک مسلمان مشرقی خاتون کی طرح صحیح معنوں میں اپنے شوہر کی رفیق حیات تھیں۔ خانہ داری کے معاملات میں علاً خود حصہ لیتی تھیں اور بچوں کی پرورش و نگہداشت میں سب سے زیادہ اپنے پر بھروسہ کرتی تھیں۔ اور ان جملہ کاموں کو وہ نسوانیت کا مقدس فرض سمجھتی تھیں۔

امور خانہ داری ہز اکسلنسی رایٹ آنریبل سر اکبر حیدری کی ذاتی اور شخصی وجاہت کے مدنظر یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ ان کے گھر کا ماحول بالکل امیرانہ ہوگا۔ محلوں کا سا ٹھاٹ باٹ ہوگا' جگہ جگہ آرام و آسایش کے سامان رکھے ہوں گے' قدم قدم پر نوکر چاکر ہاتھ باندھے حکم کی تعمیل میں کھڑے ہوں گے لیکن جب کوئی "دلکشا" میں داخل ہوتا تھا تو اس کے یہ سب تاثرات پانی کی طرح بہ جاتے ـــــ بیشک ظاہری حالت سے ضرور مالک مکان کی شخصی وجاہت کا پتہ تو چل جاتا تھا لیکن ساتھ ہی اس کے وہ ایک خاص اور نمایاں بات وہاں محسوس کرتا تھا۔ وہ گھر کا عام سلیقہ تھا۔ گھر کی ہر چیز خواہ وہ چھوٹی ہو کہ بڑی' کام کی ہو کہ نمائشی' قیمتی ہو کہ ہلکی' ایسی نہ ہوتی جو سلیقے سے نہ رکھی ہو۔ نمائش کا خیال اسی حد تک تھا کہ اس کی افادیت میں فرق نہ آئے۔ اس کی بڑی وجہ لیڈی حیدری کی قابلیت' سلیقہ اور ہنرمندی تھی۔ وہ اپنے گھر کے سارے کاروبار کو اپنی شخصی نگرانی میں چلاتی

تھیں۔ ملازمین بغیر ان کی اجازت اور تجویز کے مجاز نہ تھے کہ ایک چیز بھی ادھر سے اُدھر رکھیں۔

کھانے پینے کا انتظام انھیں کے مشورے سے ہوتا تھا۔ گھر کی صفائی خود وہ سامنے بیٹھ کر کراتی تھیں شوہر کی دیکھ بھال، اٹھتے بیٹھتے، پڑھتے لکھتے، پہنتے اوڑھتے غرض ہر چیز پر نظر رکھنا اپنا مقدس فرض سمجھتی تھیں اور جہاں تک ہوسکے یہ ساری خدمات وہ خود اپنے ہاتھوں انجام دیتی تھیں۔ گھر کا حساب کتاب خود رکھتی تھیں کوئی ملاقاتی یا مہمان آتا تو اس کی خاطر داری یا مہمان نوازی کا سارا انتظام اپنی نگرانی میں کراتی تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سر اکبر کو اپنی مصروف زندگی کا ایک لمحہ بھی گھر کے انتظامات سے متعلق غور کرنے میں صرف کرنا نہ پڑتا تھا۔ اور وہ اپنی توانائی نہایت چین اور اطمینان سے حکومتی اور قومی خدمات کی انجام دہی میں صرف کرتے، کیونکہ جب وہ باہر سے گھر آتے تو گھر کا ماحول لیڈی حیدری کی موجودگی میں جنت کے سامان فراہم کرتا تھا۔ فطرت نے لیڈی حیدری میں ایسی اعلیٰ انتظامی قابلیت و دیعت کی تھی اور ایسی غیر معمولی توانائی سے مالا مال کیا تھا کہ دیکھنے والا اس کی تعریف کئے بغیر نہ رہ سکتا تھا ایک خاص بات لیڈی حیدری میں یہ بھی تھی کہ وہ بولتی کم تھیں مگر ان کی ہر بات مفید اور کام کی ہوتی۔ وہ اپنی جگہ پہ بیٹھی خاموشی کے ساتھ ہر کام کی تفصیل پر نظر رکھتی تھیں۔ یہ ایک طرح کا نفسیاتی برتاؤ تھا جس کا ملازم پر کافی اثر پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ ملازمین پر بے جا بار ڈالنا ہرگز پسند نہ کرتی تھیں ہر کام کا وقت مقرر تھا اور مفوضہ کام ختم ہونے پر ہر ملازم آزاد تھا۔

انتظام خانہ داری کے سلسلہ میں ایک اور اہم بات یہ ہے کہ لیڈی حیدری فضول خرچی کو سخت ناپسند کرتی تھیں۔ اور کہتی تھیں کہ عورتوں میں تعلیم و تربیت کے فقدان کے باعث فضول خرچی بڑھتی جارہی ہے۔ اور روز بروز اپنے غیر دانش مندانہ اصراف کی وجہ سے مرد کے کندھوں پر بوجھ ثابت ہو رہی ہیں چنانچہ کہتی تھیں۔

"... لڑکیوں میں کفایت شعاری کی عادت ڈالی جائے۔ بہت سے خاندان اس وجہ سے تباہ ہوجاتے ہیں کہ ان کا خرچ آمدنی سے زیادہ ہوتا ہے۔ اگر گھر کا انتظام اس طرح کیا جائے کہ جو آمدنی ہو اس میں ہر مہینہ تھوڑا بچا کر رکھا جائے تو یہ روپیہ ضرورت کے وقت کام آسکتا ہے اور بہت سی مصیبتوں سے نجات مل سکتی ہے۔ جو خاندان قرض میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ ان کا سرسبز ہونا محال ہوجاتا ہے اگر عورتیں اس نکتہ کو سمجھ لیں اور یہ امر مثالوں کے ساتھ پوری طرح ان کے ذہن نشین کرادیا جائے تو وہ ان کے متعلقین بڑی راحت اور فارغ البالی

کی زندگی بسر کرسکتے ہیں۔"

اس نصیحت پر وہ خود بھی عمل کرتی تھیں اور اپنے ملاقاتیوں اور نوجوان لڑکیوں کو سختی سے اس کی پابندی کی طرف مائل کرتی تھیں۔

اخلاق وعادات

اخلاق وعادات محبت اور خلوص موقع شناسی اور فراست ہمدردانہ برتاؤ۔ مہمان نوازی شوہر کی خدمت جیسے اوصاف حمیدہ کے اعتبار سے لیڈی حیدری عورتوں کیلئے ایک مکمل نمونہ اور خواتین ہند کی نمائندہ سمجھی جاتی ہیں۔ انھوں نے اپنے اخلاق وعادات کو اصول اور نظریئے کی حد تک محدود نہ رکھا بلکہ ہر ایک کا عملی ثبوت دے کر رہیں کیونکہ وہ کہنے سے زیادہ کرنے کی قائل تھیں۔ ہم ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے مطالعہ سے ان صفات حسنہ پر روشنی ڈالیں گے۔

والدین کی خدمت

لیڈی حیدری اپنے والدین کی بہت ہی فرمانبردار تھیں ان کی بڑی خدمت کرتی تھیں۔ اور ان کے ہر دکھ درد میں دل سے شریک ہوتی تھیں۔ ان کی تین جوان بہنیں۔ دو شادی شدہ اور ایک جن کی نسبت ہو چکی تھی۔ انتقال کر گئیں تھیں۔ والدین کیلئے انکی جوان مرگی کا صدمہ شاق تھا۔ ان کے دلوں پر ایک کاری ضرب لگی ہوئی تھی۔ اور اس غم سے ہمیشہ ان کی آنکھیں نم رہا کرتی تھیں۔ اس آڑے وقت پر لیڈی حیدری اور سر اکبر حیدری نے ان کی بہت ہی دلجوئی کی اور تسکین دی اور ایسی خدمت کی کہ وہ اپنے سرمایۂ حیات کے اس عظیم نقصان کو زیادہ محسوس نہ کرسکے۔

نجم الدین طیب جی اپنے بچوں میں سب سے زیادہ لیڈی حیدری کو چاہتے تھے اور اس دختر نیک اختر سے انھیں ایک خاص قلبی تعلق تھا چنانچہ والد کے انتقال سے چند دن پہلے لیڈی حیدری نے خواب دیکھا کہ ان کے والد ہنس کر اپنی کنجیوں کا جھوکا انھیں دے کر یہ کہہ رہے ہیں "امنہ اب میں سفر کو جا رہا ہوں اور خوب سیر کرنے کا ارادہ ہے۔ اب گھر بار اور بچوں کو تم سنبھالنا" اس خواب کو لیڈی حیدری نے اپنے استاد منشی امیر علی سے بیان کیا تو انھوں نے اس خواب کی تعبیر لکھی اور کہا "اس تحریر کو اب نہ دیکھنا۔ پھر دیکھنا" آٹھ ہی روز بعد ان کے والد تخت پر اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے کہ یکایک ان کے دل میں درد اٹھا۔ انھوں نے آواز دی۔ "آمنہ۔ آمنہ" لیڈی حیدری دوڑتی ہوئی آن کے قریب گئیں۔ والد نے مسکراتے ہوئے کہا کہ یہ جھوکا لو میں کچھیم جاتا

ہوں اور دوسری جگہوں کی بھی سیر کرآؤں گا (کیھیم بمبئی سے قریب سمندر کے کنارے ایک پُرفضا مقام ہے جہاں نجم الدین طبیب جی اکثر تفریح کی غرض سے جایا کرتے تھے۔ یہاں انھوں نے ایک بہت ہی عالیشان عمارت تعمیر کروائی تھی اور اس کا نام دلکشا رکھا تھا۔ یہ عمارت انھوں نے اپنی رفیق حیات بی بی مریم خاتون کو تحفہ دی تھی) جب والد نے کنجیاں دیں تو لیڈی حیدری کا ماتھا ٹھنکا اور خواب کا منظر ان کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا جلدی سے لیڈی حیدری نے دوا پلائی وہ دوا پی کر لیٹ گئے۔ اس کے تھوڑی دیر بعد ان کا انتقال ہوگیا۔ اب جو منشی امیر علی کی چٹھی کھولی تو وہاں خواب کی صحیح تعبیر لکھی تھی۔ ان کے انتقال کے بعد گھر میں سب سے سب انھیں لپٹ کر رونے پیٹنے لگے۔ لیکن لیڈی حیدری نے بہت ضبط اور استقلال کے ساتھ سب کو سنبھالا اور دلاسا دیا۔ گھر کا سارا انتظام اب ان کے سر ہوگیا۔ ایک چھوٹی بہن۔ دو بھانجیاں۔ نوکر چاکر۔ گھر بار غرض سب کو انھیں ہی سنبھالنا تھا۔ اور انھیں نے سنبھالا۔ اس کے بعد جب حبیبہ کا انتقال ہوگیا تو ان کے تین چھوٹے چھوٹے بچے یعنے لیلیٰ خاتون (زوجہ حسن لطیف) رفیع حیدری اور طیبہ خاتون (زوجہ مقیم حیدری) بھی انھیں کے پاس آگئے۔ خود کے بھی چھ بچے تھے گویا اس طرح سے ایک زبردست ذمہ داری ان کے سر پر عائد ہوگئی تھی لیکن لیڈی حیدری نے ان سب کو اس سلیقہ سے تعلیم و تربیت دی اور اس طرح پالا پوسا کہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ انھوں نے کبھی اپنے اور بیگانے میں فرق کیا۔ سب بچوں کو وہ اپنے ہی بچے تصور کرتی تھیں۔

اولاد اور رشتہ داروں سے سلوک

ایک ماتا بھری ماں کی طرح لیڈی حیدری اپنے بچوں اور بچیوں کو بہت پیار کرتی تھیں۔ ان کی تعلیم و تربیت اور کردار سازی میں ماں ہی کا بڑا حصہ تھا۔ سب بچے ماں کا بڑا ادب کرتے اور بڑے ہو جانے کے بعد بھی خاصے ڈرتے تھے۔ اور کسی کی مجال نہ تھی کہ ماں کے سامنے ذرا بھی زور سے بات کرے۔ ماں کا حکم واجب التعمیل و تعظیم تھا۔ یہ اندرونی ضبط انھوں نے اپنے سختی یا جبر سے نہیں بلکہ محض اپنے کردار اور برتاؤ سے پیدا کیا تھا۔ ان کے بچے ان کی سیرت کے پرتو ہیں۔

لیڈی حیدری کی عادت تھی کہ رمضان کی عید پر لڑکوں کو سو روپے اور بہوؤں کو ایک ایک ساڑی تحفہ دیتی تھیں اولاد کی نظر میں یہ تحفہ ایک نعمت غیر مترقبہ تھا۔

ان کی محبت و شفقت کا دائرہ اولاد تک ہی محدود نہ تھا۔ بلکہ وہ اپنے ہر غریب اور امیر رشتہ دار کے ساتھ اسی طرح پیش آتی تھیں اور کچھ ایسا سلوک کرتی تھیں کہ سب ان کے گرویدہ تھے۔ کہا جاتا ہے کہ:۔

"وہ خاندان بھر اور کنبے کے ہر فرد کے لئے نہ صرف ایک شفیق سرپرست تھیں بلکہ ان کا وجود ایک ایسی مرکزی کڑی تھا جو سب کو ہمیشہ ملا جلا رکھتا تھا۔ اور ہر ایک کے دکھ درد میں برابر کا شریک تھا۔"

ذوقِ لطیف لیڈی حیدری کا ذوق بہت ہی لطیف اور نفیس تھا۔ یوں تو مکان کی ہر چیز سے انھیں دلبستگی تھی لیکن اپنے خانہ باغ کے ساتھ وہ گہری دلچسپی رکھتی تھیں اور خصوصیت سے پھولوں کو بہت پسند کرتی تھیں۔ اسی لئے ان کا خانہ باغ اچھا خاصہ پھول باغ تھا۔

لباس کے معاملہ میں وہ حد درجہ نفاست پسند تھیں خود بہت نفیس لباس پہنتیں اور رنگوں کی ہم آہنگی کا بڑا خیال رکھتی تھیں قیمتی سے قیمتی لباس پر ایسے لباس کو ترجیح دیتی تھیں جو سلیقہ سے پہنا جائے اور جس میں ہم آہنگی کا خیال رکھا جائے اگر وہ کبھی معمولی اور پرانے کپڑے بھی پہنتی تھیں تو اس میں نفاست اور رنگ کے تناسب کا اتنا اچھا خیال رکھتی تھیں کہ معمولی کپڑا بھی بھلا معلوم ہوتا تھا اگر ان سے ملنے والی خواتین لباس کی طرف سے بے توجہی برتتیں تو وہ انھیں بیساختہ ٹوک دیتیں اور سلیقے سے لباس پہننے کی ہدایت کرتیں۔ لیڈی حیدری کو کھیل کود کا بھی بے حد شوق تھا چنانچہ وہ اکثر ٹاباٹا (لون پاٹ) کرکیٹ۔ کروکے۔ اوکھو۔ بیڈمنٹن۔ آنکھ مچولی وغیرہ کھیلا کرتی تھیں۔ اس کھیل میں گھر کے بچے۔ دوست احباب اور خود سراکبر حصہ لیتے تھے۔ بڑے مزے کی بات یہ ہے کہ کھیلوں میں سراکبر سے یہ ہمیشہ مقابلہ کرتی تھیں اور انھیں شکست دے کر رہتی تھیں۔ وہ جیت کر خوش ہوتی تھیں۔ اور سراکبر ہار کر خوش ہوتے تھے۔ آخر عمر تک ان کا یہ شوق باقی رہا۔ اور وہ ہمیشہ بچوں میں بچہ بنکر رہیں۔

کھیل کود کے علاوہ انھیں سیر و تفریح سے بھی خاص لگاؤ تھا۔ خود سیر کے منصوبے بناتیں اور انتظامات کرتی تھیں ایسے موقعوں پر وہ اکثر کھانے خود اپنے ہاتھ سے پکاتی تھیں اور اپنی ساتھ والیوں کو بھی اپنے اپنے ذوق کے پکوان کے لئے مجبور کرتی تھیں۔ خواتین اکثر لیڈی حیدری کے ساتھ پک نک کو جاتیں اور انھیں مجبور کرکے لے جاتی تھیں۔

دوا دارو کے معاملہ میں لیڈی حیدری بالکل مشرقی تھیں۔ انھیں ڈاکٹری سے زیادہ یونانی حکمت پر بڑا

اعتقاد تھا۔ چنانچہ جب کبھی وہ بیمار ہوتیں تو اکثر یونانی علاج کرواتی تھیں۔ حکمت سے انھیں خود تھوڑا بہت لگاؤ تھا۔ اور ان کے پاس عطائی نسخوں اور چٹکلوں کا کافی ذخیرہ تھا۔ جس سے وہ کھانسی۔ بخار۔ درد سر اور دوسرے ایسے معمولی امراض کا علاج کرلیتی تھیں۔

ان کے پاس پیچش کی خاصی دوا تھی۔ ایک دفعہ ان کے لڑکے اقبال حیدری کو سخت پیچش ہوگئی تھی بہتیرا علاج کیا لیکن بے سود۔ ڈاکٹروں نے بھی عاجز آکر جواب دے دیا۔ ایسی حالت میں میجر ٹائیڈ و وکلیم الطاف حسین کو اپنے ساتھ لائے۔ اسی وقت لیڈی حیدری نے اپنے لڑکے کو اپنا نسخہ پلایا۔ اور فوراً شفاء ہوگئی۔ اس کے بعد پیچش کے علاج میں انھیں شہرت حاصل ہوگئی اور کئی لوگوں نے اس سے فائدہ اٹھایا چنانچہ سر راس مسعود کا لڑکا اکبر جب پیچش میں مبتلا ہوا اور حالت خراب ہوئی تو لیڈی حیدری نے جرأت کے ساتھ اپنا نسخہ پلایا اور خدا نے شفا دی۔

دانشمندی لیڈی حیدری بچپن ہی سے دوراندیش تھیں۔ اور آخر عمر تک ان کا یہی حال رہا۔ بلکہ زمانے کے تجربے سے اس خصوصیت میں اضافہ ہوتا گیا۔

کہتے ہیں کہ ان کی نواسی کا دودھ جب چھڑایا گیا تو وہ پیالے سے دودھ نہیں پیتی تھیں۔ ہر چند کوشش کی لیکن کوئی طریقہ کارگر نہ ہوا۔ ڈاکٹروں نے یہ صلاح دی کہ دو دن تک دودھ نہ دیا جائے اور جب اسے خوب بھوک لگے گی تو مجبور ہو کر پی لے گی۔ ایسا ہی کیا گیا لیکن تجربہ توقع کے خلاف ہوا۔ آخر بچی نے دودھ نہ پیا۔ دو دن تک غذا نہ ملنے کے باعث ایک اور تماشہ یہ ہوگیا کہ اس کی جسمانی تپش بھی گر کر ۹۵ پر پہنچ گئی۔ اب تو سب کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے اور ننھی بچی کی جان خطرے میں پڑ گئی۔ ڈاکٹروں کو بھی کچھ سجھائی نہیں دیتا تھا کہ اس ضدی بچی کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ چاہئے تھا کہ لیڈی حیدری ایسے وقت میں اپنے قلبی تعلق کی بناء پر پریشان ہو جاتیں لیکن ایسا نہ ہوا۔ ایسے میں انھیں حقنے کا خیال آیا۔ اور انھوں نے فوراً بازار سے ایک نیا حقنہ منگوا کر بچی کے منہ میں رکھا اور دو آیموں نے ہاتھ پاؤں پکڑ لئے اور دودھ پلایا گیا۔ گو لڑکی نے بہت شور مچایا لیکن یہ اسے دودھ پلا کر رہیں۔ چند دنوں یہی حال رہا۔ اور پھر وہ بچی خوشی خوشی دودھ پینے لگی۔

صبر و تحمل لیڈی حیدری مرحومہ میں بے حد صبر و تحمل موجود تھا۔ ہزار تکلیف و رنج کیوں نہ ہو وہ اسے

محسوس ضرور کرتی تھیں۔ لیکن چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیتی تھیں۔ ان میں برداشت اور ضبط کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ زندگی کے ایسے مواقع کئی بار آئے جب کہ ان کی آنکھ سے آنسو نکلنے یا کم از کم ان کے چہرے پر درد و تکلیف کے آثار نمایاں ہونے چاہئے تھے۔ لیکن دیکھنے والوں نے ان کیفیات کو ہلکی سی مسکراہٹ میں بدلا ہوا دیکھا۔

ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ سر جان اور لیڈی مارشل کو اجنٹہ کے غار دکھانے کے لئے خود سر اکبر اور لیڈی حیدری تشریف لے گئے تھے۔ اس موقع پر دوسرے اور لوگ بھی تھے۔ سب کے سب غار دیکھنے میں مصروف تھے۔ سر اکبر کی نظر جب لیڈی حیدری پر پڑی تو سخت حیران ہو گئے کہ یا تو لیڈی کو اس آرٹ سے اتنی دلچسپی تھی اور آج وہ اتنی انجان ہیں کہ گویا اس سے ذرا بھی دلچسپی نہیں۔ سر اکبر عادت کے خلاف کچھ ناراض بھی ہوئے اور دونوں میں اتنی محبت تھی کہ وہ اپنے تاثرات ان پر ظاہر کئے بغیر نہ رہ سکے۔ اس پر بھی لیڈی حیدری نے ہنس کر ٹال دیا۔ خیر غار دیکھ کر جب دوپہر کے کھانے کے لئے واپس لوٹے تو سر اکبر ذرا سست تھے اور لیڈی حیدری کے چہرے پر کوئی خاص آثار نمایاں نہ تھے۔ اتنے میں سر اکبر کے ایک رشتہ دار آئے اور حیرت سے کہنے لگے کہ جب لیڈی حیدری اور وہ غاروں کی طرف جا رہے تھے تو راستہ خراب تھا جا بجا پتھر اور گڑھے تھے۔ پتھروں پر سے پیر پھسلا اور لیڈی حیدری دھم سے گر پڑیں اور اتنی چوٹ آئی کہ وہ دو چار ساتھیوں کی مدد کے بغیر نہ اٹھ سکیں مگر اسی وقت اس خیال سے کہ کہیں "افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را" کا مضمون نہ ہو جائے وہ تکلیف کو برداشت کر کے اسی طرح مصروف سیر رہیں۔ کہ سر اکبر ابھی جوان کی ہر لہر کے اتار چڑھاؤ سے واقف تھے۔ دھوکہ کھائے بغیر نہ رہ سکے۔ جب سر اکبر نے اس حادثہ کی خبر سنی تو انھیں سخت پریشانی ہوئی اور ان کا دل ایک غیر معمولی محبت اور ہمدردی کے احساسات سے پر ہو گیا۔

اس قسم کا ایک اور واقعہ دعوت کے موقع پر پیش آیا۔ وہ اپنی جماعت کی دعوت میں گئی تھیں کہ یکایک سیڑھیوں پر سے نیچے گر گئیں اور سخت چوٹ آئی۔ جو صاحبزادی آپ کے ساتھ تھیں۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئیں کہ اب اماں جان کا کیا حال ہوگا۔ اتنے میں سب لوگ جمع ہو گئے اور انھیں اٹھا لیا اور پوچھنے لگے "کیا حال ہے" انھوں نے درد اور تکلیف کو تو ظاہر ہونے نہ دیا بلکہ مسکراتی ہوئی کہنے لگیں "کچھ نہیں۔ میں گر گئی اور گرتے

وقت یا علی مدد کہا اور بچ گئی۔

عورتوں کی تعلیم

لیڈی حیدری کی زندگی کا سب سے زیادہ درخشاں اور ممتاز کارنامہ وہ خدمات ہیں جو انھیں نے عورتوں کی ترقی و اصلاح کے لئے کیں۔ ان کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد یہ معلوم ہوتا تھا کہ عورتوں کے گرے ہوئے سماجی معیار کو بلند کریں ان کو جدید تعلیمی ترقیوں سے روشناس کرائیں۔ انھیں اپنے فرایض کا تحقیقی طور پر علم کرائیں اور پھر انھیں ترقی یافتہ اقوام کی عورتوں کی صف میں لاکر کھڑا کردیں۔ اس مہتم بالشان مقصد کے لئے وہ بالکل وقف ہوگئی تھیں اور اس کے حصول میں انھوں نے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ لیڈی حیدری کی یہی دل سوزیاں اور اصلاحی کارنامے تھے جنھوں نے ہندوستان کی مشہور شاعرہ۔ بے پناہ مقرر اور کانگریس کی ممتاز رہنما سروجنی نائیڈو کو ایک دفعہ انھیں "شعلۂ جاں بخش" کے نام سے یاد کرنے پر مجبور کردیا۔ مسز نائیڈو فرماتی ہیں۔

"(وہ لیڈی مرحومہ) شعلہ جاں بخش ہندوستانی نسوانیت کا کنول اور عورتوں کی بے تاج شہزادی تھیں اور ایسی زبردست شخصیت کی حامل تھیں کہ ہر زبان و ہر مکان میں غیر معمولی تعلیم کی حامی تھیں۔"

ہندوستانی کی اس باکمال شاعرہ نے ان تاثرات کے اظہار میں شاعری نہیں بلکہ واقعہ نگاری کی ہے اور ایک باکمال شاعر کی طرح اپنے دوست کی صفات کو جامع ترالفاظ میں پیش کیا ہے۔ کیونکہ لیڈی حیدری کی سرگرم اور باعمل زندگی کا ایک ایک صفحہ اس کی شہادت دیتا ہے۔

لیڈی حیدری نے سب سے پہلے یہ محسوس کیا کہ حیدرآباد کی خواتین میں تعلیم کا فقدان ہے۔ اس لئے انھوں نے مدارس کے قیام اور اضافے میں بلا واسطہ سرگرم کوشش کی مدارس کے کام کو دیکھنا شروع کیا۔ انھیں اپنے وسیع تجربے کی بنا پر ہدایتیں دیتی رہیں۔ غریب اور نادار طالبات کو وظیفے دلوائے اور خود اپنی جیب سے بھی امداد کرتی رہیں۔ ان کی یہ فیاضی آخر عمر تک جاری رہی۔

لیڈی حیدری نے عورتوں کی تعلیم و تربیت پر جو خصوصی توجہ کی اسکا منشا اصل میں انھیں روشن خیال بنانا تھا لیکن روشن خیالی کے معنی ان کی نظروں میں مخصوص تھے۔ بالعموم لوگ روشن خیالی کو مغرب کی اندھی تقلید پر محمول کرتے ہیں اور روشن خیالی کے معنی یہی لیتے ہیں کہ عورتیں تعلیم پاکر مردوں سے بغاوت کریں۔

اور مغرب سے آزادی کا سبق لے کر رنگ رلیاں منائیں۔ وہ قطعاً مغرب کے اس آزاد زاویۂ نگاہ کو پسند نہیں کرتی تھیں۔ وہ صرف یہ چاہتی تھیں کہ تعلیم پاکر لڑکیاں حقیقی معنوں میں سماج کی باعزت بیٹیاں ثابت ہوں شوہروں کی وفادار اور خدمت گزار بیویاں بنکر گھر کو ان کے لئے جنت بنادیں اور اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت میں خود حصہ لے سکیں تاکہ آئندہ نسلیں تعلیم یافتہ ہوکر ہندوستانی سماج کے نام کو بلند کرسکیں۔ اب یا مغربی عورتوں کی طرح قانون کی ڈگریاں لے کر عدالت میں جانا یا سیاسیات میں گتھ کر اپنی زندگی کو وقف کردینا یا محض نمائش کی خاطر جلسوں کی صدارتیں کرنا اور ایسی تقریریں کرنا جو محض پلاٹ فارم کے لئے ہوں اور دل سے ان پر عقیدہ نہ ہو ان کی نظر میں تضیع اوقات اور ناقص تعلیم کے مرادف تھا چنانچہ جب وہ مدارس کے معائنہ کو جاتیں تو یہ نہیں دیکھتی تھیں کہ لڑکیاں شیکسپیر کے ڈرامے یا براؤننگ کی نظمیں پڑھ رہی ہیں یا سیاسیات کی مشکل اصطلاحات کو سمجھ رہی ہیں بلکہ وہ یہ دیکھتی تھیں کہ پکوان کا جماعت میں کیا کام ہو رہا ہے سینے پرونے کا کیا حال ہے۔ مذہبی تعلیم کیسی دی جارہی ہے۔ لڑکیوں کے لباس پر مغربی رنگ تو غالب نہیں آرہا ہے۔ مغرب کی ریس میں لڑکیاں اپنے معصوم چہروں کو غازے اور سرخی سے مصنوعی تو نہیں بنا رہی ہیں۔ لڑکیوں کے اخلاق و آداب میں توازن تو ہے؟ یہ تھا لیڈی حیدری مرحومہ کا تعلیمی زاویہ نگاہ۔ اپنے اسی خیال کو انھوں نے خواتین کی کانفرنس کے گیارہویں اجلاس میں نہایت عمدگی سے پیش کیا تھا۔ فرماتی ہیں

"لیکن دیکھنا یہ ہے کہ موجودہ تعلیم ہمارے طبقے کی ذہنی تربیت اور مادرانہ فرائض کی بجاآوری کیلئے کہاں تک مفید ہے۔ صرف کتابیں پڑھ لینا اور امتحانات میں کامیاب ہوجانا کافی نہیں ہے۔ بلکہ لڑکیوں کیلئے جو کائنات کی ماں ہیں اور جنہیں آئندہ زندگی میں ساری قوم کی تربیت اور تعلیم کا فرض انجام دینا ہے اپنے خصوصی فرائض کو سمجھنا ہے۔ لڑکی کتنی ہی اعلیٰ تعلیم یافتہ کیوں نہ ہو اگر وہ گھر بار کے انتظام، بچوں کی نگہداشت اور تربیت، مکان کی صفائی۔ آمد و خرچ کے توازن اور دیگر امور خانہ داری سے ناواقف ہے تو وہ نہ اپنے میاں اور نہ اپنے بچوں نہ اپنے عزیزوں کو راحت پہنچا سکتی ہے اور نہ خود اطمینان اور آسائش سے رہ سکتی ہے"

اسی طرح ایک موقع پر یہ بھی فرمایا تھا کہ:

"ہم صرف میم صاحبہ بنکر اپنے خاندان اور قوم کی اصلاح نہیں کرسکتے بلکہ اپنی تہذیب اور اخلاق

کو قائم رکھ کر اور شریف بیویاں۔ شریف بہنیں اور شریف مائیں بنکر ترقی کر سکتے ہیں۔"

اس صحیح مطمح نظر کو اپنی اصلاحی کوششوں کی اساس قرار دے کر لیڈی حیدری نے لڑکیوں کی تعلیم کا بیڑا اٹھایا ان کی انتہائی خواہش تھی کہ لڑکیاں زیادہ سے زیادہ تعداد میں تعلیم پائیں تاکہ ملک کا عام ذہنی معیار بلند ہو کر ایک اعلیٰ سماج کی داغ بیل پڑ سکے۔ اس مقصد کے تحت انھوں نے لڑکیوں کی جبری تعلیم پر زور دیا اور "خواتین کی انجمن ترقی تعلیم" کے سالانہ جلسہ میں (۱۰ اگسٹ ۱۹۲۸ء) میں اپنے اسی خیال کو بڑے موثر انداز میں پیش کیا کہتی ہیں۔

"لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے جبری تعلیم مساوی طور پر ضروری ہے۔ یہ جلسہ اس امر پر شدت کے ساتھ زور دیتا ہے کہ سب سے اوّل لڑکیوں کی تعلیم کے وسائل مہیا کئے جائیں۔ اور حکومت کی طرف سے اس خصوص میں مالی امداد بھی ملے۔ اس لئے کہ تعلیم یافتہ مائیں لڑکیوں کی جبری تعلیم کے وسائل پیدا کریں گی اور اس طرح سے ہندوستانی گھر کے معیار کو بلند کرنے میں کامیاب ہوں گی۔"

اس سلسلے میں لیڈی حیدری نے یہ بتلایا کہ بادی النظر میں ان کی یہ تجویز عمل سے دور اور نظری معلوم ہوتی ہے لیکن یہ ایک حقیقت حال ہے۔ اس کی صداقت تو اس وقت ظاہر ہوگی جب اس خیال کو عمل کا جامہ پہنانے کے وسائل تلاش کئے جائیں خصوصیت کے ساتھ اس زمانہ میں جب کہ طالبات کی تعداد طلباء کے مقابلے میں بہت ہی کم بلکہ ناقابل لحاظ ہو ایسا قدم یقیناً ایک اچھے مستقبل کی طرف اٹھے گا۔ اور عظیم الشان کوشش میں اگر بہت نہیں تو تھوڑا بہت ضرور حاصل ہو کر رہے گا۔

گھر اور مدرسہ لیڈی حیدری تعلیم کے معاملے میں ایک مصلح تعلیم کے انداز میں گھر اور مدرسہ اور والدین اور اساتذہ کی ہمدردانہ شرکت عمل کی یکسر قائل ہیں۔ ان کے خیال میں محض مدرسے تعلیمی یا سماجی معیار کو بلند کرنے کے لئے کافی نہیں۔ والدین کا اتحاد ناگزیر ہے بلکہ تعلیمی کارروائیوں میں ان کے اشتراک سے ترقی سرعت پذیر ہوتی ہے۔

اس سلسلے میں مرحومہ کی دور رس نگاہوں نے ایک اور بڑی عجیب بات کا بھی پتہ لگایا تھا۔ یہ لڑکیوں کی تعلیم کے معاملے میں والدین کی عدم توجہی ہے۔ یہ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ تعلیم کی حد تک والدین لڑکوں اور

لڑکیوں کو ایک نظر سے نہیں دیکھتے۔ ان کی ساری مہربانیاں ان کی ساری کوششیں اور ان کی ساری دلچسپیاں اپنے لڑکوں تک محدود ہوتی ہیں۔ اور لڑکیاں کبھی ان کے دائرۂ تفکر میں نہیں آتیں۔ اس کی کھلی وجہ ان کے پاس یہ ہے کہ لڑکی آج نہیں تو کل دوسرے کے گھر کی ہونے والی ہے اور لڑکا ان کی اپنی زندہ جائداد ہے۔ اس خام خیالی کی اصل وجہ والدین کا محدود زاویۂ نگاہ ہے کیونکہ وہ اپنی محدود نظری اور کوتاہ خیالی کے باعث اپنے گھر کو سماج سے ہٹ کر ایک علیحدہ اکائی سمجھتے ہیں۔ اور یہ بھول جاتے ہیں کہ جس طرح آج وہ ایک غیر تعلیم یافتہ لڑکی کو دوسرے کے دامن سے وابستہ کر رہے ہیں کل دوسری غیر تعلیم یافتہ انھیں کے لڑکوں کے دامن میں خار بنکر کھٹکنے والی ہے لیڈی حیدری نے اپنی ساری عمر اپنے اسی انوکھے خیال کو ملک کی خواتین تک پہنچانے اور والدین پر لڑکی کی تعلیم کی ناگزیر ضرورت کو واضح کرنے میں صرف کی اور جہاں بھی موقع ملا ان کو اپنی نصیحت سے مستفید کرتی رہیں۔

نصاب نصاب کے معاملے میں لیڈی حیدری ایک مخصوص زاویۂ نگاہ رکھتی تھیں۔ تعلیم کا مقصد ان کے پاس نہ صرف دماغی نشوونما تھا بلکہ مشہور مصلحان تعلیم اسپنسر اور ڈیوی کے تعلیمی خیالات کے مطابق وہ افادیت اور عملیت پر بھی زور دیتی تھیں اور بار بار اصرار کرتی تھیں کہ عام تعلیمی مضامین کو چھوڑ کر لڑکیوں کے نصاب میں ایسے مضامین بھی شامل کئے جائیں جو ان کی آئندہ زندگی میں مفید ثابت ہوں۔ ایک موقع پر فرماتی ہیں۔

"لڑکیوں کے لئے لڑکوں سے علیحدہ نصاب کی ضرورت ہے کیونکہ دونوں کے میدان عمل جدا جدا ہیں ایک لڑکی کی تعلیم کا مقصد اعلیٰ یہ ہونا چاہیئے کہ وہ بہترین بیوی اور بہترین ماں ثابت ہوسکے تاکہ پرورش اطفال کے جملہ فرائض بہ احسن وجوہ انجام پاسکیں۔ اس مقصد کے لئے حکومت کو چاہیئے کہ وہ ایک کمیٹی کے ذریعہ ان تمام ضروریات کا پتہ لگائے جو لڑکیوں کی تعلیم میں درکار ہیں"

اسی طرح ایک موقع پر کہتی ہیں کہ :-

"اگر..... نصاب تعلیم میں ہماری ضرورتوں کے مطابق اصلاح ہوجائے تو تعلیم ہمارے حق میں بیشک رحمت ہوسکتی ہے"۔

اس نصابی تبدیلی کا سب سے بڑا مقصد یہ بھی تھا کہ اگر نسوانی ضروریات کے مطابق نصاب میں اس سے متعلقہ مضامین کو جگہ مل جائے تو ہمارے گھروں کی عام سماجی حالت بہتر ہو جائے گی اور کھانے والے دس اور کمانے والا ایک" کا جو احساس ہر وقت دل کو ایک ٹھیس سی لگاتا رہتا ہے دور ہو جائے گا۔ اس مطلب کے لئے انھوں نے دوسرے مضامین کے ساتھ ساتھ گھریلو صنعتوں کی تعلیم پر زور دیا تھا تاکہ "جو لڑکیاں گھر کی خوشحال ہوں وہ بھی اپنے گھر کی ہونے کے بعد فرصت کے اوقات کو ضائع نہ کریں اور جو متوسط اور غریب ہوں وہ اپنی آمدنی بڑھانے میں کسی دوسرے کی محتاج نہ ہوں اور خدانخواستہ ان پر بیوگی کی مصیبت نازل ہو جائے تو وہ اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ بھر سکیں"۔

صنعتی و حرفتی تعلیم غریب اور متوسط طبقے کی مالی حالت کو بہتر بنانے اور ایسی پردہ نشین خواتین کے اوقات فرصت کو بہتر طور پر مصروف بنانے کے لئے لیڈی حیدری نے صنعت و حرفت کا ایک مدرسہ کھول دیا تھا۔ اس مدرسہ کا منشا یہ تھا کہ ضرورت مند خواتین کو صنعتی یا حرفتی تعلیم دی جائے تاکہ وہ گھروں میں بیٹھ کر اچھا کام کر سکیں اور اپنے شوہروں کے اقتصادی بار کو ہلکا کریں۔ اس کا دوسرا مقصد یہ تھا کہ ان اشیاء کی نکاسی کا انتظام کیا جائے جنھیں عورتیں گھر پر بناتی ہیں۔ کیونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بعض خواتین گھر پر کام کاج کر کے کچھ نہ کچھ تیار تو کر لیتی ہیں لیکن ان کی فروخت کا سامان نہیں کر سکتیں۔ اس سے ان کی ہمت پست ہو جاتی ہے اور ان کی دلچسپی مجبوراً برخواست ہو جاتی ہے۔ اپنے اس خیال کے خاکے کو لیڈی مرحومہ نے ۱۹۲۸ء میں اس طرح پیش کیا تھا۔

"ہم نے مستورات کے لئے صنعت و حرفت کا ایک مدرسہ کھول رکھا ہے اور تجویز ہو رہی ہے کہ سرکار سے یہ درخواست کی جائے کہ ایک معلمہ اور ایک سواری مقرر کی جائے۔ اس معلمہ کا کام یہ ہوگا کہ سوزن کاری کی اشیاء کو مختلف جگہوں سے اکٹھا کرے اور غریب اور نادار عورتوں سے اجرت دے کر سلائی کا کام لے۔ امید قوی ہے کہ آپ کی اور حکومت کی توجہ سے اس مدرسے کو بہت جلد ترقی ہو جائے گی"۔

زبان زبان کے متعلق لیڈی حیدری کا خیال تھا کہ اردو ہی ہندوستان کی عام زبان ہو سکتی تھی۔ وہ اس کی ترقی کی خواہاں تھیں۔ اور چاہتی تھیں کہ اس کی ترقی میں عورتیں بھی حصہ لیں۔ ادارۂ ادبیات

اُردو کے شعبۂ نسواں کے خطبۂ صدارت میں آپ نے فرمایا تھا:۔

"آپ جانتی ہیں کہ اُردو ہندوستان کی پیداوار ہے اور وہاں کی مروجہ و مشترکہ زبان ہے اگرچہ یہ زبان برابر ترقی کرتی چلی جارہی ہے اور ایک صدی کی بہ نسبت دوسری صدی میں زیادہ وسعت اور ہمہ گیری حاصل کررہی ہے۔ لیکن اب بھی ضرورت ہے کہ اس کو وسیع سے وسیع تر بنایا جائے تاکہ موجودہ زمانہ کی علمی و ادبی ضرورت کو پورا کرنے کی اس میں قابلیت و استعداد پیدا ہوسکے اور ہمارے سرمایۂ علم و ادب میں روز افزوں اضافہ ہوتا جائے۔ اگرچہ ہماری گورنمنٹ یہ کام انجام دے رہی ہے مگر علاوہ گورنمنٹ کی توجہ کے قوم کے افراد نہ صرف مردوں بلکہ عورتوں کا بھی فرض ہے کہ اس میں حصہ لیں۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ ایک ایسے اہم شعبہ میں حیدرآباد کی اکثر بیویاں کام کرنے کو تیار ہیں مجھے امید ہے کہ یہ کام جاری رہے گا۔ ترقی کرے گا۔ اور ملک کی خواتین زیادہ تعداد میں اس میں شریک ہوں گی۔ اور گرم جوشی سے حصہ لیں گی۔

عورتوں کی سماجی اصلاح

لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کے علاوہ لیڈی حیدری نے یہ بھی محسوس کیا کہ حیدرآباد میں کوئی ایسا مرکزی مقام نہیں جہاں آپس میں مل جل کر تبادلۂ خیال کرسکیں اور اصلاح معاشرت کی تجاویز کو روبہ عمل لاسکیں۔ اسی خیال کے مدنظر لیڈی حیدری مرحومہ نے "حیدرآباد لیڈیز سوشیل کلب" اور "انجمن ترقی تعلیم خواتین" کے کاروبار میں حصہ لینا شروع کیا۔ اول الذکر کلب ۱۹۰۱ء میں قائم ہوا تھا۔ اس میں ہندوستان اور انگریز خواتین شریک تھیں گویا یہ ایک طرح مشرقی اور مغربی تہذیب کا سنگم تھا۔ شروع شروع میں اس کلب کے جلسے محبوبیہ گرلز اسکول میں ماہوار منعقد ہوا کرتے تھے۔ اور اس تقریب میں ایک مختصر سا اٹ ہوم بھی ترتیب دے لیا جاتا تھا اس موقع پر عورتیں آپس میں میل جول بڑھاتیں اور مختلف سماجی اور معاشرتی موضوعوں پر دل کھول کر تبادلۂ خیال کرتیں تھیں۔

لیڈی حیدری نے اس کلب کو پروان چڑھانے اور اسے حیدرآبادی خواتین کی ایک مرکزی انجمن بنانے میں مقدور بھر سعی کی۔ انھیں کی استعانت اور مشوروں سے اس کلب کے لئے ایک خوبصورت اور باقاعدہ عمارت تعمیر ہوگئی۔ پھر یہاں مختلف کھیلوں اور تفریحوں کا بھی انتظام کیا گیا اور ہفتہ میں کوئی دو دن خواتین جمع ہونے لگیں۔ آج کل یہ انجمن بہت خوبی سے اپنا کام کررہی ہے۔ بیگم مہدی یار جنگ فرماتی ہیں

"حیدرآباد کی خواتین میں جو میل ملاپ اتحاد و شائستگی پائی جاتی ہے اس کی بنیاد بڑی حد تک مرحومہ لیڈی حیدری نے ڈالی تھی۔"

حیدرآباد لیڈیز سوشیل کلب کے علاوہ لیڈی حیدری کی وابستگی "انجمن ترقی تعلیم خواتین" سے بھی تھی۔ ۱۹۳۷ء یعنی آغاز ہی سے مرحومہ نے اس کی صدارت قبول کی۔ انھوں نے اس کے سالانہ جلسوں میں جو خطبے پڑھے وہ ان کی علمی اور عملی دلچسپیوں کے آئینہ دار ہیں۔ ۱۹۳۹ء میں مرحومہ نے اس کی صدارت سے سبکدوشی اختیار کی لیکن پھر ۱۹۴۶ء میں اس کی سرپرستی قبول کی یہ انجمن بھی حیدرآباد کی نہایت سرگرم اور مخلص انجمنوں میں سے ہے اس نے اب تک خواتین کی بہت سی مفید خدمات انجام دیں۔

ان کے علاوہ لیڈی حیدری نے مختلف چھوٹی اور بڑی انجمنوں کی سرپرستی اور صدارت کی ہے اور اکثر اداروں کی بنیاد ڈالی۔ ادارۂ ادبیات اردو شعبۂ نسواں کے کاروبار سے بھی انھیں بے حد دلچسپی تھی چنانچہ باوجود علالت کے انھوں نے ۱۹۵۷ء میں اس کے پہلے سالانہ جلسہ کی صدارت کی۔ وہ چاہتی تھیں کہ نئے نئے ادارے قائم ہوں اور کام کو مختلف حصوں میں تقسیم کر کے ہر ایک اپنا کام کریں۔ اس سلسلے میں وہ اس بات پر زور دیتی تھیں کہ ادارہ قائم کر لینا کوئی بات نہیں لیکن اسے کامیابی اور خلوص کے ساتھ چلانا کمال ہے۔ یہ حقیقی کام کرنے والے کا زاویۂ نگاہ ہے چنانچہ ادارۂ ادبیات اردو کے شعبۂ نسواں میں صدارتی خطبہ دیتے ہوئے مرحومہ نے نصیحت فرمائی تھی۔

"میں چاہتی ہوں کہ اس موقع پر کارکنان ادارہ سے یہ بھی کہوں انجمنیں بنتی ہیں۔ ادارے قائم ہوتے ہیں مگر جلد سے جلد ان گرم رفتاری میں فرق پڑ جاتا ہے۔ اگرچہ ہر ایک ابتداء تو شاندار ضرور ہوتی ہے لیکن سعی و عمل کی کمی اور زمانہ کی سرد مہری و بدمزاقی انھیں پست ہمت اور سست کار بنا دیتی ہے۔ لیکن جو لوگ مستقل مزاج اور ثابت قدم ہوتے ہیں کوئی وقت کوئی تکلیف ان کے پائے استقامت کو اپنی جگہ سے نہیں ہٹا سکتی"

ہندوستان کی مایۂ ناز خاتون مسز نائیڈو اپنی ایک لیڈی حیدری کی نسوانی اداروں سے دلچسپی اور ان کے کام سے متعلق فرماتی ہیں۔

"ہزاروں عمارتیں چونے اور پتھر کی موجود ہیں جو لیڈی حیدری کی زندگی کی شاہد ہیں انھوں نے

اس ریاست (حیدرآباد دکن) میں کئی اداروں کو قائم کرکے انھیں فروغ دیا مگر ہم بحیثیت ایک ہمدرد نسوانیت کے اپنے دلوں میں ان کی یاد تازہ رکھیں اور اپنی محبت و دوگنی کوششوں سے ظاہر کریں تاکہ ہندوستانی خواتین کے مستقبل اور خدمت مخلوق کے خواب جو وہ دیکھا کرتی تھیں صحیح نکلیں۔"

سچ تو یہ ہے کہ لیڈی حیدری نے گزشتہ تیس پینتیس سال کے عرصے میں ایک سچے دوست۔ دانشمند مشیر۔ اور پُرخلوص رہبر کی طرح خواتین دکن کی ترقی و اصلاح میں حصہ لیا۔ اور ان میں ایثار قربانی اور مخلوق خدا کی خدمت کا صحیح جذبہ پیدا کیا۔

پبلک اور سماجی خدمات

ہمارے ملک میں عام طور پر یہ عقیدہ راسخ ہو چکا ہے کہ پبلک خدمات یا سماجی اصلاح کا منصب صرف مردوں ہی کو حاصل ہے اور عورتوں کا کام محض یہ ہے کہ وہ گھر کی چار دیواری میں مقید رہ کر کھانے پکانے کے جھگڑوں میں مصروف رہیں یا پھر بچوں کو بہلائیں۔ صنف نازک کی قابلیت کے متعلق یہ تصور بہت ہی پرانا ہے لیکن ہندوستان میں نوّے فی صد لوگ اسی کے قائل ہیں۔ لیڈی حیدری ہندوستان کی ان گنی چنی خواتین سے تھیں جو علم اور تجربے کی روشنی سے مستفید ہو کر سماج میں عورت کے صحیح مقام اور اس کی ضرورت کو سمجھ گئی تھیں اور اس خیال کو پھیلانے میں انھوں نے ہندوستان اور ہندوستانی سماج کی بنیادی خدمات انجام دی ہیں۔ گو زمانے کے لحاظ سے وہ اسی دور کی تھیں لیکن ان میں قدامت پسندی کا رنگ ذرا بھی نہ تھا۔ انھوں نے اپنے عمل سے ثابت کر دکھایا کہ عوام کی خدمت کرنا جس طرح مرد کا فرض ہے عورت بھی اس سے سبکدوش نہیں رہ سکتی اور اگر سچ پوچھا جائے تو عورت مرد کے اس بوجھ کو ہلکا کرکے سماج کے لئے ایک اہم اور مفید عنصر ثابت ہو سکتی ہے۔

۱۹۰۸ء میں رود موسیٰ کی طغیانی کا زمانہ حیدرآباد کے لئے نہایت پُرآشوب تھا۔ شہر حیدرآباد کے در و دیوار پر مصیبت کے بادل اُمڈے چلے آرہے تھے۔ موسیٰ ندی کی طغیانی نے راتوں رات ہزاروں خاندانوں کو برباد کر دیا تھا۔ اور ہزاروں مخلوق خدا بے یار و مددگار راہ مراد ہر بھٹکتی پھر رہی تھی۔ حکومت نے اس آفت آرضی سے نجات دلانے کے لئے ہر ممکنہ کوشش کی۔ بہت سے مردوں نے اپنی بے لوث خدمات پیش کیں لیکن عورتوں میں لیڈی حیدری نے بھی اس میدان میں حقیقی طور پر قدم رکھنے کی جرأت کی۔ وہ ایک مضبوط دل

اور باہمت خاتون کی طرح سماجی بندھنوں کو توڑ کر میدان میں نکل آئیں اور خلق اللہ کی خدمت میں مصروف ہوگئیں انھوں نے اپنا کام اس خلوص اور جانفشانی سے ادا کیا کہ قدامت پرست نکتہ چینوں کی زبان بند ہوگئی اور وہ بھی بیختہ "انسانی" جذبے کی تعریف کرنے پر مجبور ہوگئے۔ عوام میں ان خدمات کی کافی شہرت ہوگئی اور حکومت برطانیہ نے بھی اعتراف کے طور پر "قیصر ہند" کے درجہ اول کے تمغے سے انھیں سرفراز کیا۔ یہ پہلا اعزاز تھا جو لیڈی حیدری نے حاصل کیا۔

طغیانی کے ایک سال بعد یعنی ۱۹۰۹ء میں جب حیدرآباد میں طاعون دبا پھوٹ پڑی اور جب جنگ عظیم کے بعد ہی ۱۹۱۹ء میں انفلوانزا کی ستم کاریاں شروع ہوئیں اور ہزاروں خدا کے بندے جاں بحق ہونے لگے تو حیدرآباد میں شائد ہی کوئی گھر ایسا ہوگا جہاں ایک سے زیادہ بیمار نہ ہوں۔ ان ہر دو پر آشوب زمانوں میں لیڈی حیدری نے اہل ملک کی خدمت کے لئے اپنے آپ کو مردانہ وار وقف کر دیا اور نفس نفیس ڈاکٹروں اور نرسوں کے ساتھ تیمارداری کرنے میں مصروف رہیں۔ اور انھیں ہر طرح کی طبی اور مالی امداد بہم پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی ان کی انسان دوستانہ اور بے لوث خدمات کے مدنظر اگر انھیں حیدرآباد کی فلارنس نائٹنگیل کے نام سے یاد کیا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔

لیڈی حیدری کی یہ سماجی خدمات نہ صرف حیدرآباد ہی تک محدود تھیں بلکہ یہ شریف جذبہ ساری انسانی برادری سے وابستہ تھا۔ ۱۹۳۴ء میں بہار کے اور ۱۹۳۵ء میں کوئٹہ کے تاریخی زلزلوں کے وقت وہاں کے باشندوں کی مصیبت اور تباہ حالی کی داستان سن کر ان کے حساس دل کو ٹھیس لگی تھی۔ مرحومہ کا حساس دل انسانی عذاب سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اور انھوں نے اپنی پوری سرگرمی اور جانفشانی سے ان زمین کے آفت زدہ لوگوں کے لئے ایک فنڈ کا افتتاح کیا۔ اور اپنی محنت، اثر اور رسوخ سے جس طرح ہو سکے پچاس ہزار کی خطیر رقم جمع کی اور زلزلوں کے مصیبت زدگان کی امداد کے لئے بھیجا۔

اسی طرح ستمبر ۱۹۳۶ء میں جب کہ ان کی عمر کافی ہو چکی تھی صحت بھی خراب ہو چلی تھی۔ دماغی اور جسمانی کام کرنے کی صلاحیت میں انحطاط کے آثار ہویدا ہو رہے تھے۔ حیدرآباد کے مختلف ضلعوں سے قحط سالی کی خبریں آنے لگیں۔ ایسی حالت میں بھی وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں اور قحط زدہ اضلاع کے باشندوں کی

کی امداد کے لئے خواتین دکن سے اپیل کی کہ وہ اپنے مفلوک الحال ہم وطنوں اور عاجز انسانوں کے لئے دل کھولکر چندہ دیں اور کار خیر میں ان کا ہاتھ بٹائیں کئی خواتین آپ کی اس اپیل سے متاثر ہوئیں اور ایک فنڈ کھولا گیا۔ جس کی جمع شدہ رقم سے قحط زدوں کی مدد کی گئی۔ جنگ عظیم کے وار ریلیف فنڈ کے لئے لیڈی حیدری کی مساعی بہت مشکور ہوئی تھیں۔ اور حالیہ جنگ کے سلسلہ میں بھی خواتین کی ایک جنگی ذیلی کمیٹی قائم ہوئی تھی۔ اس کی صدارت کا کام مرحومہ انجام دے رہی تھیں۔ اسی سلسلہ میں خواتین حیدرآباد کی طرف سے ہندوستانی فوجی سپاہیوں کے لئے تحائف روانہ کئے گئے تھے۔ اس آخر عمر میں مرحومہ کی یہ ہمدردانہ خدمات ہر طرح لائق ستائش اور خواتین کے لئے قابل تقلید ہیں۔

مذہبی رواداری

لیڈی حیدری ایک سماجی مسلمان خاتون تھیں۔ ان کی زندگی کا ہر پہلو اسلامی معاشرت کا آئینہ دار تھا۔ نماز روزہ کی سخت پابند تھیں اور کلام پاک کی تلاوت ان کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ خواہ کتنے ہی اہم کام میں کیوں نہ مصروف ہوتیں۔ مگر جیسے ہی نماز کا وقت آتا جھٹ سے اُٹھ کر چلی جاتیں۔ اس فرض کے آگے دُنیا کے دوسرے تمام فرائض اُن کی نظروں میں ہیچ تھے۔ یہ خصوصیت ہز اکسلنسی سر اکبر اور ان میں مشترک نظر آتی ہے۔

اس درجہ راسخ العقیدہ مسلمان ہونے پر شائد کسی کے ذہن میں یہ خیال گزرے کہ ان میں کسی طرح کا تعصب و جانبداری ہوگی۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ مذہب اور بنی نوع انسان ان کے پاس بالکل دو علیحدہ چیزیں تھیں۔ اگر وہ مذہب کی متوالی تھیں تو ساتھ ہی ان میں بنی نوع انسان کے ساتھ ہمدردی اور دوسرے مذہب یا فرقہ والوں کے ساتھ رواداری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی ان کا صاف اور متوازن دل مذہبی اختلافات کی باد سموم سے بالکل پاک تھا۔ وہ دوسروں کے مذہبی معاملات میں دخل نہیں دیتی تھیں بلکہ ان کا خیال تھا کہ ہر شخص مذہب کے معاملہ میں آزاد ہے۔ اور ہر شخص کو اپنے مذہب کا احترام کرنا چاہئے۔ چنانچہ جس طرح وہ اپنے مذہب کا احترام کرتی تھیں۔ دوسرے مذہب کا بھی اسی طرح احترام کرتی تھیں۔ اور سب بنی نوع انسان کو ایک نظر سے دیکھتی تھیں۔ کہتی ہیں۔

"... میں خاص طور پر جتانا چاہتی ہوں کہ ہمیں اپنے کاموں میں کسی صورت سے بھی فرقہ وارانہ تنگ نظری

کو دخل نہ دینا چاہیے۔ ہمارا مقصد ایک ہے اور ایک ہی رہے گا سماج کی اصلاح اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک تمام بکھری ہوئی قوتیں ایک نقطہ پر سمٹ نہ جائیں ہم ہندوستانی مشرقی تہذیب کی خصوصیات کیساتھ ایک نسوانی دنیا کی تعمیر کے خواہاں ہیں جو جدید ترقی یافتہ زمانے کا مقابلہ کر سکے اور جس کی گود میں پرورش پانے والے صحیح معنوں میں مادر وطن کے خیر اندیش اور خدمت گزار ہوں۔ اپنی نگاہوں کی کوتاہیوں کی مدد کیجئے اور اپنے دل کو مخلوق کی خدمت سے بھر لیجئے اور اپنی مادرانہ شفقت کے دامن کو دنیا کے اس سرے سے اُس سرے تک پھیلا دیجئے اور کوشش کیجئے کہ مذہب و ملّت کا اختلاف آپ کے فکر و عمل کو محدود نہ کر دے یقین جانیے کہ مذہب کا صحیح احساس اور خدا کی قدرت پر صحیح اعتقاد اپنی جنس تو ایک طرف غیر جنس کا دُکھ بھی گوارا نہیں کرتا جب ہی تو اس کو ربُّ العالمین پکارا جاتا ہے۔ کیونکہ اس کی رحمت کا آغوش ساری دُنیا کے لئے یکساں طور پر وسیع ہے۔ آپ نے سر محمد اقبال کا یہ مصرع سُنا ہوگا۔ ع

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا

اس کے معنی یہی ہیں کہ آپ سخت مذہبی پابندی کے بعد بھی اپنے حسن سلوک اور رواداری سے اتحاد و اتفاق کی ایک خوشگوار فضا پیدا کر سکتے ہیں۔ مذہب وجدانی چیز ہے۔ اس کو اپنے دل میں پوری طاقت کے ساتھ رہنے دیجئے لیکن بنی انسان کی اصلاح کے موقع پر ایک متحدہ محاذ قائم کیجئے۔ یہ ہے وہ وقت کی پہلی پکار اور یہ ہے خدا کی خوشنودی کا واحد ذریعہ۔

لیڈی آمنہ حیدری کے یہ الفاظ ان کی حقیقی مذہبی رواداری کی پوری پوری ترجمانی کرتے ہیں۔ وہ اپنے ہر عمل میں اس کی پوری پوری پابندی کرتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے پرستاروں کا دائرہ نہ صرف مسلمانوں تک محدود تھا بلکہ اس میں ہندو۔ عیسائی۔ پارسی۔ اور دیگر فرقوں کے لوگ بھی شامل تھے۔ وہ مختلف مذاہب کے پیشواؤں سے مساوی طور پر اعتقاد رکھتی تھیں۔ اگر ان کی جبین نیاز حضرت یوسف صاحبؒ شریف صاحبؒ حضرت حبیب العید روسؒ۔ حضرت احمد حسین امجد اور حضرت بی اماں صاحبہ کے آستانوں پر جھکتی تھیں تو اُن کا رواداردل جگت گرو شنکر آچاریہ اور اربند گھوش سے یہی اعتقاد رکھتا تھا۔ یہ خصوصیت بھی ان میں اور ان کے رواداد شوہر میں بالکل یکساں ہے۔

انتقال

۱۹۳۷ء کے بعد سے لیڈی حیدری کی صحت خراب ہوتی گئی۔ گو اس وقت ان کی عمر ساٹھ سال کی تھی۔ چونکہ ایک طویل مصروف زندگی بسر کرنے کی وجہ سے عام قویٰ میں انحطاط پیدا ہو چلا تھا۔ اور عمر کے اثرات وقت سے پہلے ہی ظاہر ہونے شروع ہو گئے تھے۔ چاہئے تھا کہ ایسے وقت میں وہ آرام لیتیں لیکن ان کے فرض شناس اور حساس دل نے انھیں چین سے بیٹھنے نہ دیا اور وہ اپنی عمر اور قویٰ کا لحاظ کئے بغیر اسی طرح مصروف کار رہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۴۰ء کے شروع ہی سے ان کی صحت زیادہ خراب ہوتی گئی اور جون کے مہینے میں خون کا دباؤ زیادہ بڑھ گیا۔ یہ حملہ بڑا کاری ثابت ہوا۔ جس سے وہ چودہ جون ۱۹۴۰ء کو شب کے ساڑھے آٹھ بجے اس دنیا سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئیں۔ اس وقت ہز اکسلنسی رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری اور ان کے صاحبزادے بستر مرگ کے قریب تھے۔

ہز اکسلنسی کے لئے یہ جدائی بڑی شاق گزری انھوں نے غالباً پہلی دفعہ حقیقی غم کو محسوس کیا مگر ایک سچے مسلمان کی طرح ان کے دل کو اس بات سے تسلی تھی کہ ان کی رفیقۂ حیات ایک ایسے جہاں میں پہنچ گئی ہیں۔ جو خالق سے قریب تر ہے۔

انتقال کے کچھ دیر بعد ہی تجہیز و تکفین کے انتظامات شروع ہو گئے۔ رات ہی میں میت کو غسل دیا گیا۔ اور کفنانے کے بعد میت حال میں رکھ دی گئی۔ دوسرے دن سوا گیارہ بجے جنازہ دلکشا سے نکلا۔ سر اکبر میت کے ساتھ ساتھ تھے۔ اور خیریت آباد کی مسجد تک برابر کندھا دیتے آئے۔ خیریت آباد کی مسجد میں نماز جنازہ پڑھائی گئی۔ اور جنازہ کو دائرہ سلیمانیہ لے جاکر دفنایا گیا۔ فاتحہ کے بعد سب لوگ مغموم اور افسردہ دل واپس لوٹے۔

اس روز بلدہ حیدرآباد کے زنانہ اور مردانہ مدارس اور دفاتر کو عہدہ داران متعلقہ نے تعطیل بھی دے دی تھی۔

اس انتقال پر ملال پر اعلیحضرت بندگان عالی نے ۹ جمادی الاول ۱۳۵۹ھ ہجری کو بکمال مراحم خسروانہ سر اکبر حیدری کی ان گراں قدر الفاظ میں تسلی فرمائی۔

"ما بعد تاسف برین سانحۂ حزن و ملال اہل خاندان را

تعزیت مید ہیم جائے شکر است کہ مرحومہ را عمر طبعی و نعائم دُنیوی حاصل شد و ہم از دُنیا بہ دارِ عقبیٰ بہ نیک نامی رفت کہ بسیار کار خیر از او بہم جنسانِ او رسید۔ و این ہم بشکل یاد باقی است۔

مادہ تاریخ رحلت لیڈی حیدری

اسمش امنہ بیگم مرحومہ

زن و شوہر بہ اُلفتے بنگر رُوز و شب ہم محبتے بنگر

زِجہان اُو برفت عثمان گفت آمنہ ہم بہ تُربتے بنگر

فیض محمد صدیقی
بی اے، ایم۔ ایڈ (عثمانیہ)

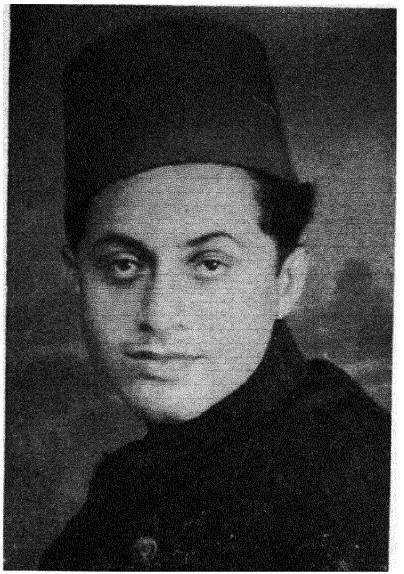

Mr. Shoebullah Khan,
Asst. Editor Urdu Section.

Mr. Asgar Ali,
A Prominent Cricketer, Represented the State XI in the Ranji Trophy.

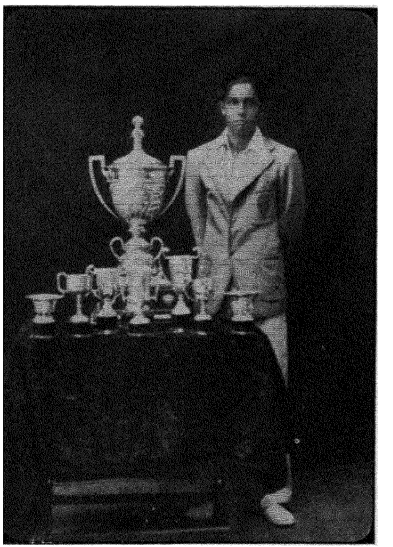

Mr. Mohiuddin Kaiser,
Hyderabad's No. 1 Tennis Player; Obtained the Triple Crown in the MacKenzie Tournament. Kaiser is the Pride of Osmans and the Hope of Hyderabad.

Distinctions :

The following students stood first in the University examinations last year.

Mr. Hameed Moinuddin, M. Sc.
Mr. Naimuddin Siddiqi, M. A.
Mr. Mohd. Abdus Sattar, LL. B.
Mr. Mohd. Abdul Hafeez, B. Sc.
Mr. Hanmanth Rao, B. Sc.

We congratulate them heartily.

Competition :

The following students secured prizes in the essay-writing-competition for the "Hydari-Number."

Urdu	Mr. Anwar Ahmed Siddiqi	IV year	1st prize
„	„ Shamsuddin Siddiqi	III „	2nd „
„	„ Muslehuddin Siddiqi	II „	1st „
„	„ Khatib Moinullah Husaini	II „	1st „
„	„ Mahmood Ali	Special Prize	
English	Mr. Saeed Ahmed Meenai	IV year	1st prize
„	„ Shahid Ali Khan	IV „	2nd „
„	„ Rabinandan Mathur	II „	1st „
„	„ S. B. Raj	I „	2nd „

We congratulate them.

Lastly, let me thank Mr. Moosvi, our Managing Editor whose co-operation and incessant efforts bring our term of office to a successful end.

MIR HAMEED ALI,
Asst. Editor, English Section.

A match between the past and present boys of our University and the Nizam College was of utmost interest, and we won. Our team scored in many of the matches against various teams. Though we lost the "Salar Jung Tournament" due to some unforeseen difficulties, the efficiency and spirit of our players remained beyond any criticism. Hisam, Siraj, Shahid, Asgar and Kazim played in the Moinuddoullah tournament. Asif and Mazher were elected to play for "The Rest."

Foot-ball :

President: Prof. Ghosh.
Captain: Mr. Mohiuddin Shah Khan.
Secretary: Mr. Abdul Aziz Siddiqi B. A (Osman.)

Our team defeated the Nizam College and the City College in semifinal and final. An exhibition match was also arranged between the past and present boys which was attended by our Pro.-Vice-Chancellor.

Tennis :

President: Dr. Abdul Haq.
Secretary: Mr. S. M. Ashhad Razvi, B. A. (Osman.)

The great achievement of our team is the success which was secured against "Travancore," in the Inter-University South Zone final, and it had to proceed to Lucknow afterwards. Kaisar, Rahim, Maqsud and Ashhad represented our University in "Lucknow Baroda" tournament.

A club tournament and a match between the past and present, were also held. We congratulate all the office bearers and players.

Besides the address of the chairman of the meeting, the speeches of Prof. Haroon Khan Shervani and Dr. Yusuf Husain Khan were important.

Physics Union :

President: Prof. Wahidur Rahman
Vice-president: Mr. Abdul Hadi B. sc. (Osman)
Secretary: Mr. Zainulabdin.

Under the auspices of the Union the students visited the "Automatic Telephone Exchange." Lectures on "X-rays", "Gravitation", "Theory of relativity" and "Radio-activity" were arranged.

Urdu Union :

The Union held a "Urdu Conference" in which an Inter-College essay-writing competition was arranged.

Marathi Union :

President: Prof. Raghonath Bhosari
Vice-President: Mr. Jaganath Rao Qulkarni.
Secretary: Mr. Rajeshver Rao.

In the installation meeting of the union, different lectures were arranged. An annual ceremony was also celebrated in rememberance of former Maharata poets, Dr. Madhu Rao and Bhasker Rao. The Union also edits a grafted paper "Prakash."

We congratulate the officials of the union.

Sports :

Cricket President: Prof. Hosain Ali Khan.
Captain: Mr. Mir Hisamuddin Siddiqi.
Secretary: Mr. Rajkumar Singh B. sc. (Osman.)

Sectional - unions :

Theology: President. Mr. Habib Tayab B. A. (Osman)
Vice-President. Mr. Shaik Ahmed Bin Husa
Secretary Mr. Attaullah Shattari

Installation meeting of the union was held under the presidentship of the Pro-Vice-Chancellor, which was attended by a number of guests. Mr. Rahman, the retiring president read the report of the last year, and then Mr. Tayab delivered his address. The meeting was over after the inspiring speech of our Pro-Vice-Chancellor.

Law - union :

President. Mr. M. Abdul Sattar B.A., LL.B. (Osman)
Vice-President. Mr. Razack Ali Khan B.A. (Alig)
Secretary Mr. Hamid Ali B.Sc (Osman)

Installation meeting of the union was held under the chairmanship of Hon'ble Nawab Alam Ali Khan B. C. L. (Oxon), Chief Justice (High Court). The meeting was attended by the judges and many of our distinguished law-graduates.

Justice Khawaja Abdul Aziz addressed the students and gave them valuable advice. The presidential address of Mr. Sattar and the speeches of Prof. Husain Ali Mirza, Mr. Rauf and Mr. Ahsan were important and interesting. Justice Alam Ali Khan, the chairman of the meeting addressed the students and promised to consider their demands favourably. A luncheon was arranged in his honour.

History union :

President Mr. Zakiuddin
Secretary Mr. Shahid Ali Khan

The installation meeting was presided over by Hon'ble Ghulam Mohammed, Finance Member, of the Executive Council.

Promotions and Transfers :

During the current year Prof. Krishnan left our University to take up a post as Professor of English in Nagpur University.

His efficiency, his genial manners and his services to our Magazine have endeared him to us. Let us pay a tribute to him for his services.

We are glad that Prof. Doraiswami has been nominated our new adviser for the English Section vice Professor Krishnan. We congratulate him and look forward to his advice and guidance in the conduct of the Magazine.

Mr. Yunus Wafaqani and Mr. Abdul Qayum Khan Baqi, have been promoted as the Personal Assistant, to the Pro-Vice-Chancellor and Lecturer in Urdu respectively. Mr. Naimuddin Siddiqi has been appointed as junior-lecturer in the English Department. They need no introduction as they are all old boys of the College. The literary talents of Mr. Baqi are well known.

Mr. Naimuddin Siddiqi obtained a well-deserved First Class in English language and literature. We congratulate him heartily.

University day :

This year University Day was not celebrated owing to the fact that the Students' Union had suspended its activities. We hear however, that the Union will be revived.

Exhibitions :

It is the first time in the history of the Magazine that we have introduced a stall in the exhibition. It was indeed a good idea of Mr. Moosvi to suggest this and introduce the public to the literary activities of the past and present students of the University.

College News

Our tenure of office comes to an end with the issue of this Special-Number. This Number was proposed by Mr. Syed Ali Mohamed Moosvi, Managing Editor of the Magazine, as a tribute from our brethren to our benevolent, Late Sir Akbar Hydari. It is needless to mention that Sir Akbar's services to our Alma-mater are the facts of history and are acknowledged on all hands.

Thanksgiving to our August Ruler:

Our Pro-Vice-Chancellor called a general meeting of the Staff and Students of the University to express our humble gratitude to our benevolent Ruler, for the appreciation which His Exalted Highness expressed at our keeping high morals in these days of loot and sabotage. Nothing can be a better testimonial to the morals and discipline of our brethren than this most gracious Royal-proclamation.

Independence-day:

Under the auspices of the Law Union, the Asif Jahi Independence-day was celebrated. His Excellency Nawab Saheb Chattari, President of the Executive Council and the Chancellor of our University presided over the meeting.

A distinguished Visitor:

Sir Firoz Khan Noon, Member of the Viceroy's Council addressed the students exhorting them to loyalty to their King and country.

A Dinner:

The students of the Hostel "B", arranged a dinner in honour of Dr. Raziuddin Siddiqi, who afterwards delivered a lecture on "Iqbal and the doctrine of death". The achievements of Dr. Raziuddin Siddiqi are the just pride of our Alma-mater. His researches in Higher Mathematics have gained him an international reputation He is an ornament to our country and our University.

speakers but diplomacy and high ability in law are alien subjects to them. We request such persons and heads of institutions to study this volume with impartial eye. Criticism is catholic, but not sectarian. Then, we are sure, they would see our Chancellor from different perspective. Opposition in healthy spirit will be ever welcomed; personal grudge and partial look are repugnant to educated men. Pay your homage with sincere attitude to the memory of the man who was loved, and honoured in East and West alike. His was a life that speaks greatness and grandeur.

As a Chancellor, Sir Akbar endeavoured hard to provide facilities to students and the staff alike. Love of the University never left his heart whether he was in Hyderabad or Delhi, India or the Seat of the British Empire. While leaving Hyderabad he delivered a recorded speech at the station addressing the students as "My Dear Children", tears were seen in his bright and gleaming eyes. With this love and zeal, he assisted the University to see its rapid development and renown. The university has attained this desirable object nay life-aim of our Chancellor.

May God bless and shower His mercy over the historical monument of the great Genius who served the country for a long period of thirty five years in different capacities. We are struck with:

آ تھہ گئیں دنیاں سے یا رب کیسی کیسی ہستیاں
رونیے کس سکھہ کو او کس کس کا ماتم کیجیے

SYED ALI MOHAMED MOOSVI,
M. A. (Final)
Managing Editor and Editor English Section.

Our Benevolent Chancellor.

It is needless to throw light on the meritorious services of our late lamented Chancellor, Sir Akbar Hydari. His experience in educational and other departments are universally admitted, his love of Sciences and Arts is ardently respected and his keen and sincere interest to serve the State is passionately praised with reverence and gratitude.

He enjoyed the confidence of H. E. H. and strove hard to achieve unforgettable name as the Builder of Modern Hyderabad – a title presented to him in his life time. Such was the Magnetic personality of Sir Akbar.

He was an ardent lover of mankind. He was a devoted Muslim and an enthusiastic admirer of all religions. His sincere participation in "Mujlises" his constant visits to Koh-a-Moula and other religious places which are truly depicted by Mr. Liakatullah are proofs that he was a devout Muslim. People who consciously and intentionally close their eyes to such un-deniable facts, do not deserve our sympathy and respect. Even his enemies do not and cannot deny that his period of premiership was unique in every way. To forget Sir Akbar is to offend God; to displease the Almighty will eclipse our activities. A few personalities, of course in the political field, argue with personal grudge that Sir Akbar has done little for the betterment of the State. We beg to protest against this view with all the emphasis at our command. Such a view is injurious and harmful even for themselves. Sir Akbar was neither an angel nor a saint. He had short-comings as we have. Yet, he had an intellect such as few can possess; we aspire to have it. His opponents individuals and institutions both, are like children absorbed in construction of a building on sand. They have neither a broad view nor systematic education. They may be eloquent

In his democratic and human ways, Sir Akbar was unique. One of his lenses slipped down from the frame to the ground once. It was after some search and strain that his old "Jamadar" lifted the lens from below the carpet on the floor. Then Finance Member, Sir Akbar greeted the Jamadar with a hearty "shahabash" and gently patted him on the back. A temporary employee of the University was once ill and in hospital. In the humdrum of routine, his services were dispensed with and other arrangements made for his work. The new incumbent began work also. In the meanwhile, news reached Sir Akbar. This was his loud-thinking: "What will they think of Hyderabad if this dismissed man goes out and tells people that his services were dispensed with when he was ill in hospital?" Orders were cancelled, and the post was kept vacant till the man recovered and joined duty again. Of course that man is now in permanent service. Notwithstanding, he was unbending in matters of self-respect. A vote of censure was insisted on by him against an officer of the Indian Civil Service for a breach of official etiquette. Another high officer was made to apologise for airing an opinion which he was not competent to give.

An ardent lover of tradition, he was by no means a reactionary. His services in analysing the relations between the Crown Representative and the Indian States has largely contributed to the solution that is to come of the Indian State problem: he was a champion of an Indian Federation, but no less a champion of the autonomy of the States.

It is said that a dependent country can rarely produce a genius whose outstanding quality is originality. Sir Akbar is not alone among the great sons of India in achievements realised or distinctions earned, but in his mystic architecture of life he did excel many of his fold. The true value of a possession becomes patent in its absence, and now that India has nothing more of Sir Akbar Hydari (except his memory), a cavity has occurred which has yet to be appropriately filled.

S. KESAVA IYENGAR M. A.,
Professor of Economics (Nizam College)

Sir Akbar was ambitious and should have shone better if he had stuck to service in British India. His career in Hyderabad was by no means smooth-sailing, but he preferred service of a constructional type to mere self-aggrandisement. Albeit, his independence was of an original type. At an early stage, he was asked: "What will you do if you are retired tomorrow." His cool and firm answer was: "I shall proceed to Bombay by the next train."

His "Departmentalisation" scheme was "unorthodox" in several ways, but proved of substantial service in stabilising Hyderabad finances and financial machinery. Finance was almost completely charged from personal to institutional methods. He did not attach much importance to catchwords and slogans, and the discipline he imparted to Hyderabad finance was extraordinarily chastening.

The purchase of the Railway forty five months before due date was again another original and mystic stroke. All possible neglect by the "goer" was precluded, and that was a diplomatic success of the first magnitude pioneering later achievements elsewhere. It is common knowledge that if income tax has not yet come to Hyderabad, it is on account of the fat earnings by the Railway. Still, his belief in the importance of European officers in the Railway finds ample testimony in the N. S. R. even to day.

Sir Akbar's personality was no less original. His memory had a place for the meanest of men: he had constant access to the greatest of them. He counted a large number of Hindus among his close colleagues and friends, and his associations with high British officers in and outside the Dominions were exceptionally cordial and beneficial. Possessed of a rare acumen, his industry had few parallels. It was a common sight to see half a dozen cars in the compound of "Dilkusha" after 10 P. M., the visitors being high officers of State and leaders of the public, waiting by appointment.

Akbar Hydari - the Mystic Architect.

That the late Right Hon'ble Sir Akbar Hydari was a genius could not be denied reasonably by any one. The most conspicuous feature of his genius was the mystic originality with which he built.

He was not at all a radical reformer, and yet was a champion of freedom for women. The social activities of Lady Hydari and the marriages of the Princes with members of the family of the ex-Calipha (with a high order of education and culture) have had far-reaching influences on the ideas and activities of the women of Hyderabad.

A devout Muslim, Sir Akbar was an unconditional anti-communalist. His love of the country was so profound that he did not like communal schools and hostels and other communal institutions, not even communal tournaments. He agreed to become a member of the Muslim Hall in the Dacca University *only after* ascertaining that Rabindranath Tagore was among the members.

His was a Lutheran protest against "slavery" in Indian education. Whatever other objections (real and imaginary) there might be against the Osmania University as it is today, no one can question the *one big achievement* - of raising an Indian language to the status of a medium in the highest of University courses. At the same time, his tribute to the system of education introduced by Macaulay, as he put it in one of his addresses at the Nizam College, was that that system was responsible for producing stalwart protestants like himself.

Home at Delhi; stranger even, to feel that the man who wielded such great power once should be lying so helpless at the hands of fate; helpless and alone in far-off Delhi, separated from his wife and most of his children; his face was pale; and he breathed with difficulty; his intermittent coughs seemed as though to say that the path that had been long, and by no means smooth, had left him footsore; and a tired look hung over his face. The next day the world heard of his death, and before the week was over he was lying beside his beloved wife in the graveyard at Hyderabad, where

"Soft stillness and the night become the touches of sweet harmony"

SHAHID ALI KHAN
Senior B. A. Class.

evening, when he found a leisure hour or two, he used to be seen playing with them and running after them round the lawns of his house. With children his character was shown at its best.

Any estimate of his character would be incomplete without taking into account the part Lady Hydari played in his life, and without realizing the tremendous blow her death was to him. Mr. Amery, paying a tribute to Sir Akbar Hydari at the India Society memorial meeting said:—

"No one could know him without realizing how much he owed to Lady Hydari; she was a true partner in his tastes, interests and ideals, and I venture to think that his sanity, optimism, and his power of making friends rested in great measure on his domestic happiness".

Many of us remember the scene of her funeral procession in the heat of a June afternoon, when well over seventy, he insisted on walking all the way to the Khairatabad mosque shouldering the bier. Those who knew him, knew also that beneath the apparent courage, happiness and jovial temper the end was approaching.

" 'Tis all a Chequer-board of Nights and Days

Where Destiny with men for pieces plays;

Hither and thither moves, and mates and slays,

And one by one back in the closet lays".

They were not long separated by death. He went away in August 1941 to join the Viceroy's Executive Council. But Hyderabad returned not the man but his corpse. It was strange to see him, on a cold and cloudy January evening one day before his death, lying at the Wellingdon Nursing,

"Who ne'er his bread in sorrow ate,
who ne'er the mournful midnight hours
weeping upon his bed has sat,
He knows ye not, ye heavenly powers!"

Thus with courage and conviction he toiled on, and his hard work is almost proverbial. "Fame is the spur"; perhaps it was. But in his case he attained it before the end came. No one can ever deny that he possessed an abundant energy, an almost infectious zest for work, and an inexhaustible attention to details.

His personal simplicity and religious devotion were also equally apparent. How many times from a meeting or a function, had he excused himself at sunset, spread his mat and said his prayers. So punctual was he about prayers that nothing stopped him from getting to his mat at prayer time. Once in February 1933, a nasty accident was the result of this punctuality, but that did not deter him. While returning from Delhi by the Grand-Trunk Express, he got up as usual at four o'clock to say his prayers, when returning from the bathroom of the saloon he mistook the door leading out to be the entrance to his own bedroom. He fell on the line but fortunately the train was stationary at the Jhansi junction; hearing the whistle however, he hauled himself back to the saloon with great difficulty, and then called out to one of the party for help. He was soon helped into his bedroom, but, it is said, in spite of a fracture in the arm he did not miss his prayers. That indeed is an example of his great devotion to religion.

Those who knew Sir Akbar Hydari, know also his intense love for children. He always used to have one or the other of his little grand children around him, and of an

Again, in 1917 at Calcutta he said :—

"It has been well said that while the education of a boy helps him only, the education of a girl lifts a whole family to a higher stage of mental and moral (and may I add physical) life".

Supporting his previous utterances, and quoting Dr. Lungen of Frankfort, Sir Akbar Hydari said on another occasion:--

> "Let us now begin to pay the debt of centuries. To the grace and personal charm of women let us add the charm of a trained intelligence, let us remove the bandage from their eyes and lead them to the fountain of knowledge that they too may have their share in the gathered wisdom of the ages, that they may despise empty frivolity and idle chatter, and may learn to know the highest and most inspiring of all human pleasures the joys of mental achievements".

This zeal of his found expression in the Mahboobia Girl's School in Hyderabad, and the Women's College of the Osmania University.

But he had other interests too. Art in all its forms had a great appeal for him. Because of this love of art he established the Archaeological Department which is mainly responsible for the preservation of the high-water marks of Indian civilization represented by the frescoes of Ajanta, the magnificent caves of Ellora, the once mighty fortress of Daulatabad, and the numerous architectural beauties of Bidar and Gulbarga.

Like all men of action, he had to face many difficulties to overcome innumerable obstacles, but firmly believed with Goethe: -

He was mainly responsible for the launching of the Osmania University, the only institution of its kind in India, where urdu is the medium of instruction. Thus at least one Indian language was developed to the status of a University language, and the alien character of our education removed. The knowledge thus imparted through this language gave rise to that clarity which is essential for independent thought, while the compulsory English course formed a vital part of a student's cultural equipment and opened to him fields for wider reading. However, this is still a highly controversial subject, for controversy there must be, as we have said before, as to the goodness or otherwise of an action. Sir Akbar Hydari thus replied to critics: -

> "Do not, I pray you, regard movements of this kind (Osmania University) as in any way separatist, or provincial or sectarian. They are based upon the first principles of self-respect, reverence, and respect for your cultural traditons which are not the insidious enemies but the strongest supporters of a National Evolution".

To his supporters this argument was right, to his critics it, perhaps, was not.

Sir Akbar Hydari was also very enthusiastic about women's education. Presiding at the first Hyderabad Educational conference in 1915 he said: —

"That country can never be educated or progressive whose women are steeped in ignorance.....If the mothers who give our children their first lessons in life.....lessons which must inevitably influence their entire future.....are devoid of education, how can we be sure that when the children go out of their hands they will be blessed with real education and morals?

a unity in the diversity of faiths and religious tenets; and this unity he advocated. To him our ills were due to lack of realization of this fundamental unity of religions. He spoke of the Hindu and Muslim civilizations as the "Two eyes of India" and in a well worded Presidential address at the 21st. All Indian Mohamedan Educational Conference at Calcutta said,

"It will not be the growth but the death of Indian Nationalism if the Muslims of India fail to be impressed by the greatness of Asoka, Chandragupta, or filled with pride and joy at the immortal frescoes of Ajanta and the sculptured monuments of Ellora, or fail to derive inspiration from the glorious songs of Jayadev and Tukaram, or find food for deep and satisfying thought in the discourse of Sri Krishna or Gautama the Buddha. It will not be the growth but the death of Indian Nationalism if Hindus are not filled with pride at the architectural splendours of the Moghuls and the Adil Shahis, at the political achievements of great rulers like Sher Shah and Akbar, at the fine heroism of noble queens like Chand Bibi and Nurjahan, at the liberal statesmanship of devoted ministers like Mahmud Gawan and Abul Fazl, or the wide learning of scholars like Al Beruni and Faizi, or at the inspiration of poets like Amir Khusro and Ghalib.....for all these and many more, whether Hindu, or Muslim, or Christian, loved India and worked for her".

He was not only a statesman and a scholar, but also an educationist with original ideas. Halide Edib writes in 'Inside India' :– "He (Sir Akbar Hydari) was spoken of as the cleverest financier of India.....But when I met Sir Akbar at Salam House, I could not bring myself to associate him with statistics, finance and positive science. He seemed more a man of culture; as a matter of fact, I thought of him as a minister of education".

Graduating from St. Xavier's College, Bombay at the age of Seventeen, he, in February 1888, still in his eighteenth year, entered the Indian Financial service. As a young man he was always an obedient son and it is said, that having taken to smoking heavily when quite young, he gave it up at the instance of his mother.

In October 1905 he came to Hyderabad as Accountant-General, and two years later became Financial Secretary. In July 1911 he was transferred to the Home Office as Secretary. Here he worked till February 1920, when he reverted to the British Indian Service as Accountant-General of Bombay. But he soon returned in June 1921 to Hyderabad as Finance member of the Executive Council, and finally in 1937 succeeded the late Maharaja Sir Kishen Pershad Bahadur as President. He was knighted in 1928, was the "ornament of the Round Table Conference" as Mr. Churchill called him, played a prominent part in the deliberations in London and was made Privy Councillor in 1936.

As a man he was simple and austere. Sir Francis Younghusband presiding over the Memorial meeting held for Sir Akbar Hydari at the India Society, London, on 10th February 1942 said,

"I have heard him say that as a young man he was, if not an atheist, at any rate an agnostic, but his experience of life showed him that was absolutely *irreverent* to suppose that this wonderful universe and all the life around could possibly be the result of mere mechanical causes." Thus he became a devout Mussalman. But while he was devoted to his own religion, he saw the truth in all religions and appreciated them for that truth. It was his daily habit for years that every morning he used to read along with the Quran, the Bhagvad-Gita, and Sri Aurobindo's "Life Divine" was always the companion of his leisure hours. He thus saw

Sir Akbar Hydari - A Memoir.

"De mortius nil nisi bonum". He had his faults, and who has not? In this essay I pretend to be neither a sycophantic admirer nor a hyper-cynical critic. What is intended is to view his life as that of a man, who has his good side and his bad one. It must be remembered, however, that there are two types of men; those who believe in action, and those who are contented only with contemplation and inactivity. Sir Akbar belonged, as we know, to the former class. Now when a man keeps silent, it is possible that his shortcomings will be hidden, but if he acts, it is different. Action requires boldness, ability and above all, courage to face the criticism that must necessarily be the result of such action. Particularly in these days of democracy and party system, even when the whole nation realises the capabilities of the leaders of the various parties, yet one party denounces the leaders of the other as though they are nothing short of trash. Therefore, while reviewing the life and characteristics of a man, the tendency of the age must not be forgotten, and one must not be led away by the sweeping remarks of either party, his blind admirers, or his bitter critics.

Mohamed Akbar Nazarally Hydari - for that was his full name, was born in Bombay on 8th November 1869. From the very beginning family traditions cultivated in him a taste for scholarship. He read, and read widely not only History and Economics, but English Literature, Latin and Law. He developed a great liking for law and as far as he was concerned, his mind was made up as to his future career - that of a lawyer. But fate had something else in store, and he was asked by his parents to sit for the Financial Civil Service examination held at Bombay. He obeyed against his wishes, and passing that examination "entered", as he said, "the Finance Department with tears"

the Governor-General's Executive Council, and the tributes which poured from all parts of this vast sub-continent on the passing away of this great man in Delhi on the 8th January 1942, were numerous and touching. The Governor-General-in-Council, for example, while mourning the loss of a distinguished and trusted colleague who had enriched every office he occupied during his long career, was pleased to observe that by his death, India had lost 'a distinguished son and the Crown a valuable Counsellor'. His Exalted Highness felt no less grieved at the loss of one who had served him so long and faithfully, and gave expression to his gracious sentiments in an exquisite Persian chronogram which runs as follows:

عجب شیون کہ بادِ عنبری کرد
تاسّف نیز چرخِ چنبری کرد
چہ تاریخ آمدہ در طبع عثمان
منازل سے نگر توحیدری کرد

(سنہ ۱۳۶۰ ہجری)

K. M. ANSARI,
Political Secretary.

reserves to stablize currency, to meet famine expenditure and to help local industries; and last but not least, the establishment of a State Bank for Hyderabad.

Thomas Carlyle once described genius as 'an infinite capacity for taking pains', and even Sir Akbar's critics admit that he was an indefatigable worker. While endowing him with a fund of ceaseless energy, Providence also bestowed on him, in full measure, the vision of a farsighted idealist along with the business acumen of a practical statesman, which enabled him, once he was convinced of the usefulness of a scheme, to overcome all difficulties and to push it through to a successful conclusion. And we see the result of this rare combination of Nature's gifts in the form of a flourishing university which imparts instruction of the highest order through an Indian language, and of a sound financial system which has been able up till now to stand the stress and strain of a world war without recourse to additional taxation.

Sir Akbar was fortunate in possessing the confidence of His Exalted Highness the Nizam throughout his long service of over 33 years in Hyderabad, which enabled him to rise from the post of Accountant-General to that of President of His Exalted Highness the Nizam's Executive Council. This came prominently into view, when on the eve of Sir Akbar's relinquishment of office in August 1941, His Exalted Highness through a Gazette Extra-ordinary, recorded his warm appreciation of Sir Akbar's long and devoted service and, as a mark of special favour, granted him a handsome pension. Not content with these generous expressions of patronage, His Exalted Highness, true to the Asafia tradition, also sanctioned liberal hereditary allowances to Sir Akbar's children.

Sir Akbar did not survive long after his departure from Hyderabad to assume the responsibility of a Member of

Sir Akbar Hydari-
An Appreciation.

Certain friends and admirers of the late Sir Akbar Hydari decided about three years ago to get his portrait painted by an eminent artist and present it to the Osmania University. They asked the artist to make the picture as symbolic of Sir Akbar's life and work as his canvas permitted him to do. Mr. Gladstone Soloman has faithfully carried out the mandate with the happy result that the Chancellor's robes in which Sir Akbar posed for the artist, and the yellow crest of the Osmania University radiating the light of learning all round, emphasise the part played by Sir Akbar in giving a splendid and tangible expression to the idea of imparting higher education through the medium of an Indian language. In the background, in a corner is seen the Hyderabad Railway Station to remind the onlooker that Sir Akbar was instrumental in effecting the transfer of the railway system in these Dominions from an English Company to His Exalted Highness the Nizam's Government several years in advance of the date when such option could be exercised by Government under the agreement. To these solid achievements a softer touch has been given by placing a portrait of the late Lady Hydari on a stool to Sir Akbar's right, thereby commemorating the deep love and affection which existed between the couple. This picture would have been complete if the stretch of canvas had allowed the artist also to depict the achievements of Sir Akbar in the realms of archaeology and finance: all that he did to restore and preserve the invaluable treasures of art at Ajanta and Ellora; his reform of the State currency; his scheme of the departmentalisation of finances; the constitution of separate

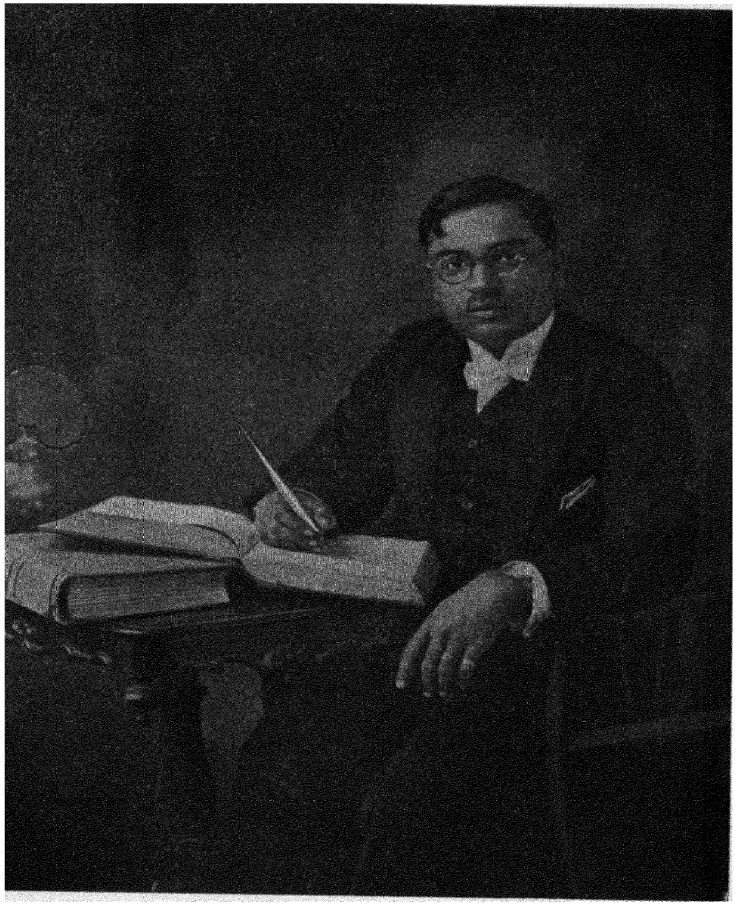

Mr. Abdul Quiyum Khan Baqi

M. A. (Osman) Ph. D. II. Year.
Our Ex-Managing Editor,

A good musician, a promising artist, a well known essayist, a great Scholar, very popular for his amiable manners.

Mr. Baqi has been recenty appointed senior lecturer in the Department of Urdu. His Yeoman work in Urdu Literature in highly appreciated.

Pershad in a mushaira at his mansion. It was Friday – the day he used to meet poets. At 10 A.M. when the Maharaja was engaged in listening to poetic recitations, Sir Akbar's visit to him was announced. The Maharaja with his usual courtesy met him downstairs and brought him in our midst. Sir Akbar's visit was perhaps official. Yet, when the Maharaja joyously told him that he was in the company of poets, not politicians, Sir Akbar heartily proposed to sit down with us. Fortunately it was my chance to begin and I opened the recitation of my Persian verse. When I recited the following couplet.

مرا آزاد از کنج قفس کن کہ پروازم بہ زد ربال و پر یندست

Sir Akbar, to my surprise was struck with it earlier than the Maharaja. He asked me to recite it three times and then remarked:

"Freedom is the attribute of God – God is free, and so we must be". These words still ring in my ears, when I relate the humble story.

At our University, in the great Library Hall, on the occasion of his farewell dinner, I heard Sir Akbar deliver his speech which proved to be his last. As a chancellor, and not as a minister Sir Akbar seemed to be among us, not as a guest of honour, but as a friend. His speech, with clear and well-defined accents, was reminiscent of those days when Sir Sayyid, Hali and Mohsin-ul-mulk used to address great congregations in their own unbiased, selfless style. In his voice, I heard something of the accents of those past makers of Urdu. I found myself then not at the dinner table, but in a noble Shrine of Art, where an apostle of Knowledge was humbly imparting to us his impressions and message of art and achievements. The Osmania Institution, as long as it survives will never forget its benevolent progeniter. Thus ends my story of a great man whom I never met.

M. A. QAYYUM KHAN BAQI. M. A. (Osman)

terms, but the spirit under-lying them passes unidentified. Sir Akbar had a spirit of human toleration and benevolence. That spirit was a hall mark of genius, and with that spirit he had a sacred courage to face the masses and obey his inner voice.

As we all see, the world is a grand show case. Through the casement, we find human beings, great and small, come out in masses, like Christmas gifts from the box of Santa Claus. Like a huge mole in the screen, we find hundreds of faces and figures, thousands of changing scenes multitudes of smiles and tears, weak and stiff necks move around--Men cheered by crowds, and men kicked by crowds--Men ruling the masses and men ruled by the masses. In this drama of human life it is a real pleasure to be 'far from the madding crowd and watch real greatness. Being free of force and influence, void of all contact and contamination, to break all chains of relativity and to see, enjoy and appreciate genius, it is something worth while. It has some thing of divine greatness in it. It was with such a "bliss of solitude" that I had a chance to behold Sir Akbar moving in the drama of life. To me his short stature, his grey head, his firm lips and his magic smile seemed to be apparitions of some value, a living form of human excellence. From my own shelter I watched Sir Akbar as a great man, and I found him so.

Lastly, Sir Akbar's name is in my mind, as I found him to be a lover of art, culture and beauty. I desire to say something in detail on the subject of art and life, but for fear of digression I only remark that, to me, the salvations of our life's tragedy solely depends upon art, literature and the spritual culture which they infuse into our souls. Sir Akbar was a patron of art, and he had something of the culture, the soul of the artist in him. And to me this is a remembrance of great things. Once we were with the late Maharaja Sir Kishen

own convictions, I found Sir Akbar always smiling on things that were to him good and noble.

Another impression of Sir Akbar's greatness to me is, of a peculiar nature. When he was in his proper elements when he was in an atmosphere where serene knowledge, valuable and creative art and sound education seemed to abound, he surprisingly seemed to love self-sacrifice. He held self-denial to be a nobler power than self-assertion. He even went so far as to exaggerate and outstep the limits of diplomacy and control. He helped great artists, educationists and men of letters in his own way, which evidently seemed to verge upon favouritism. But, I think it was not so. It was only his exaggerated self-denial. I never failed to read this trait of high character in him—whatever he was and wherever he was.

Next, I come to another phase of his greatness.....his unshaken conviction in certain principles of life, his strict adherence to them. Generally Sir Akbar is claimed to be a diplomat. But a diplomat is an opportunist, a man ever ready to meet an emergency. Sir Akbar as I said before was a victim to such a diplomacy, no doubt, but in his heart of hearts I could find him to be struggling with chance and circumstances, and go back to the verdict of his conscience. He might have failed in this struggle yet the very life in his self understanding, the rock-like firmness and faith in his convictions, go a great way to present him as a great man. As our beloved poet Ghalib has put it.

وفا داری بہ شرط استواری اصل ایماں ہے

(Fidelity with strict firmness and aherence is real faith) Sir Akbar had a faith and fidelity of his own. He might have been a "Brahman", but he was interred in the "Kaba of faith'. Men define this faith in their own terms. 'Partiality' 'Ambition', 'Fame', 'Idiosyncracy', Politics–are some of those

words with him. On the contrary, I shrank back when I had a chance to face him in public. Why was it so? Was it my own backwardness of mind or was it Sir Akbar's influence on me? I think it was the latter. In Hyderabad, I am used to experience a man, who is acclaimed as great, of a peculiar nature. He is great in the sense in which he shrinks from common humanity, and even takes pride to undervalue any greatness, which is not a legacy, but a free, though rare gift of Nature. To me greatness is found in the love of man.

اصل تہذیب احترام آدم است

(True culture lies in the reverence of Man). I believe in a man's greatness when he in his greatness succeeds to find greatness in others. I think him to be great who by his high ideals raises life, civilization and his fellow beings to the level of his idealism. Thus man becomes a maker of his own fate, as well as a reformer of others' fortune. To my surprise while Sir Akbar, as a minister was compelled to maintain his air of ministership he, as a man, loved the human in life. That is my first affirmation of his genius. Sir Akbar passed a life of continuous struggle between his humanity and his officialdom. There are some men who transcend these bounds and break off the chains. Iqbal, Tagore, and Gandhi are such. Our Muslim dictator Jinnah is not yet free. He too is struggling with the chains of office and freedom of human service. But thanks to the struggle itself the greatness is there. Sir Akbar was great in such a struggle.

Once I was able to find out through reliable sources that my name to him was not new. His hand never fell back from doing me good. Since the death of my father, the late Nawab Ahmed Nawaz Jung Fani, Sir Akbar's memory was never without his remembrance, nor did he forget to render us, two brothers, unknown help, through that memory. Like a man, born to love, to respect, and to be kind under his

A Great Man whom I never met.

The word 'great' is a very ambiguous word in Hyderabad. It has come to mean so much that it means almost nothing. The variety of connotations and meanings attached to that unfortunate term, has practically deprived us of any standard of judgment. So I feel ill at ease to use it as a stepping stone of my arguments in this article. Yet, as I am sure, I find some sense of real greatness in the life of our 'grand old man' who is no more, I, without fear of using any unnecessary eulogy, propose to lay down a few humble impressions of mine about the late Sir Akbar.

Let me first begin with a few refutations. I never thought of Sir Akbar as a great man in the sense in which I feel he himself had a cherised desire to show himself—say, as a diplomat, a financier and so forth. To me the desire if it was, was in its very nature his weakness. And this weakness is common to all humanity. Great men do not live to be really great. There are impediments of a very serious nature in the evolution of the real Man. When he is surrounded by an atmosphere of defeat and difficulty, he naturally seeks by-paths and other channels to display his talents. I do not know what would have been the real achievement of Sir Akbar's life had he followed the natural course. But this I know that he could have been a greater man then.

Again to me his great political influence, his nationalism, his benevolent and God-fearing temperament his ministership were not factors of his true greatness. I think he pushed him elf into these circumstances. I was never moved by them, and so even under a few compulsory obligations I never ventured to approach him in the capacity of a humble petitioner or a eulogist. I never met him face to face, nor did I avail myself of any chance to exchange a few

direction of his feet, he got enraged that it should have been kept there. On my handing it over to him at his request, he reverentially placed it on his head and had it kept in a sideroom saying that he would never forgive the man who kept the Photo there and asked Lady Hydari to have an enquiry made and to find out the offender.

Such was Sir Akbar who rose to such heights of worldly position and yet humbled himself so low before God and God's shadow on earth.

M. LIAKATULLA
Finance Secretary.

Master whether the shorter route to Hazrat Shah Afzal Biabani's tomb was by road or along the railway track. On being told that although the shorter route was along the Railway track, there were some small bridges in between, Sir Akbar preferred to walk a distance of over four miles by road. Syed Omar offered to send a peon to the Taluqdar for getting a car as it would be too much for Sir Akbar to walk that long distance at the dead of night. Sir Akbar reminded his Personal Assistant of the saying that the greater the trouble taken in such matters, the greater will be the 'Savab' (reward). It was for that reason that he preferred to walk to the shrine and had not told them till then why he was breaking his journey at Kazipet. After they had walked about a mile, they saw the dim light of a conveyance coming towards them. Sir Akbar ordered the peon to stop that conveyance coming towards them. On Syed Omar remarking that it may be a tonga or jhatka, Sir Akbar said that it did not matter. It turned out to be a jhatka and Sir Akbar with his assistant got into it and the peon occupied the front seat. The tomb was reached at about 2 A. M. and Sir Akbar after reciting his prayers returned at about 4 A. M. to his saloon.

Some people have regarded Sir Akbar's visits to Arabindo Ghosh's Ashram as a weakness in his religious beliefs. As a student of Sufism he had natural attraction towards persons having sufistic tendencies. This accounts for his visits to Pondicherry.

I should not omit to relate here one more incident which I am sure will supremely appeal to the people of Hyderabad, who rightly regard our August Ruler as the shadow of God (Zillullah). I happened to be at the bedside of Sir Akbar when he became ill with an attack of gallstone. He desired to get up and was helped by me. As soon as he saw a painting of H. E. H. resting against the wall in the

the Hyderabad Delegation to the First Round Table Conference told me, that feeling very warm in the Cabin, he went on deck at about 2 A.M. one morning. He was surprised to see Sir Akbar and Lady Hydari standing with uplifted hands in a corner. Not wishing to disturb them, he returned to his Cabin and mentioned the matter to Sir Akbar on the following day. In explanation, Sir Akbar told Razvi that he and Lady Hydari had arranged with the Captain of the ship, that when the ship reached the nearest point to Medina, they should be informed of it. As a result of this arrangement he said they were able to offer prayers from a privileged point.

That Sir Akbar was not puffed up with his worldly position and offered penance will be borne out by an incident in the Railway Hotel at Aurangabad. Almost the last official tour, which Sir Akbar performed was in connection with the opening of the Wireless station at Aurangabad, when I also accompanied him at the invitation of the Wireless Department. Mr. K. M. Ansari, the then Council Secretary and I were put up in the Railway Hotel next to Sir Akbar's suite. I awoke at about 4 A. M. and was about to consult my watch, when I heard Sir Akbar groaning aloud. Thinking, that he had an attack of gallstone pain to which he was prone, I woke up Ansari, who peeped through the window curtain and told me that Sir Akbar was in 'Sijda' (prostration).

Sir Akbar's reverence for shrines and dargahs is well known, but few people know the depth of this feeling in him. The late Mr. Syed Omar, who was personal Assistant to Sir Akbar when he was Finance Member told us that on his return journey from Madras, Sir Akbar had a message sent by Railway Control telephone for cutting off his saloon at Kazipet station and for its being attached to the Hyderabad train the following morning. Sir Akbar alighted from the train and asked Syed Omar to ascertain from the Station

Some close glimpses of Sir Akbar Hydari.

The private life of Sir Akbar Hydari was adumbrated by his official life to such an extent that, with the exception of those who were privileged to come in close contact with him, people in general were not aware of many noble traits in his character. He was essentially a devout Muslim but not a bigoted muslim. He always kept himself "Bavozu" (ablutions) and would excuse himself for a few moments from meetings or from his office-room whenever he felt the necessity of performing ablutions afresh. He always carried with him a small book of prayers which he recited whenever he visited sacred places like Dargahs, tombs etc.,

Sir Akbar was so punctilious about prayers, that, even when he was confined to his room by serious illness, he would perform them in bed. He contracted a severe type of whooping cough in Calcutta and was ordered to bed on his return to Hyderabad. I visited him one afternoon and was shown in. I saw to my consternation that he was lying flat on his back with a vacant stare. I hurriedly retraced my steps and asked the servant to inform Lady Hydari that Sir Akbar was in a serious condition and that he did not even recognise me. The servant told me complacently "The Saheb must be saying his prayers in bed as he has a fit of the cough if he sits up".

One great ambition of the late Sir Akbar was to visit Mecca and Medina and perform Haj. He was not however destined to realise this ambition. I will relate an incident in this connection which will show how deep this desire was. Mr. Mohiuddin Hamid Razvi H. C. S., who had accompanied

where every kind of facility is provided for women to study. He did a lot for the education of women in Hyderabad. Girls are going to schools and colleges in great numbers and shortly we hope to see Sir Akbar Hydari's ideals realised; and the coming generations might fulfil all the expectations that a progressive country requires.

Such, in brief, were the activities of the Late Sir Akbar Hydari in the field of education. He was a first rank educationist who worked vigorously and energetically for the upliftment of Hyderabad through education on sound and recognised principles and transformed it into a modern state.

MIR SUJJAD ALI M. ED. (Osman)

pupils should be taught according to their aptitudes and it was for this reason that he slowly and gradually wanted to open, vocational and industrial schools which would give an impetus to the industry of the country and this would go a long way in solving the problem of un-employment in the State.

Sir Akbar Hydari was an ardent advocate of women's education. In 1915 he presided over the first Hyderabad Educational Conference and said; "If the mothers who give our children the first lessons in life, lessons which must inevitably influence their entire future, are devoid of education, how can we be sure that when the children go out of their hands they will be blessed with real education and morals?" These words might be repugnant and might, according to orthodox Muslims, be odious, but their truth cannot be gainsaid. He believed and believed firmly that "That country can never be educated or progressive whose women are steeped in ignorance.....". He pleaded for the enlightenment of our women so that they may have a cultural outlook in life.

Once speaking at Vaniambadi (Madras) Sir Akbar Hydari quoted Dr. Lungin in the following words "Let us now begin to pay to woman the debt of centuries. To the grace and personal charm of women let us add the charm of a trained intelligence, let us remove the bandage from their eyes and lead them to the foundation of knowledge that they too may have their share in the gathered wisdom of ages, that they might despise empty frivolity and idle chatter, and learn to know the highest and the most inspiring of all human pleasures, the joy of mental achievement."

The Mahboobia Girls' School, in Chaderghat was the first fruit of his efforts in the field of women's education and the culminating point was the Osmania Women's College

not like Mahatma Gandhi who would try to force the Wardha Scheme in spite of strong opposition. Sir Akbar Hydari appointed experts to go into the question of secondary education and after careful consideration and in the light of the experience of these experts he was to introduce a revolutionary scheme.

It will not be out of place here to quote the Times of India's editorial "What Hyderabad.....demonstrated above all was, while so many other parts of India are debating, Hyderabad is one of those that is doing.....Typical of the new spirit which is abroad in the Nizam's Dominions was the great emphasis placed on primary, scientific and technical education. With the introduction of the new scheme..... a decisive break will be made with the old hundred per cent literary tradition which had for long not only rendered Indian education ineffective but which has even shown such little discrimination, caused a lowering of literary standard, practical work, scientific progress, exploitation of natural resources, a fuller and more abundant life for all, these are the watch words of the new education in Hyderabad. And a better watch-word there could not be" Such is an unbiased eulogy of Sir Akbar Hydari's work.

It is a well known fact that before Sir Akbar Hydari's the expenditure on education was only ten lakhs but now mainly through his efforts it is more than one crore and twelve lakhs of rupees. He knew that there was something wrong with the Educational Department and began enthusiastically reorganising it. As we already know Sir Akbar Hydari was from the beginning insisting that Secondary education must be given through the mother-tongue if we were to produce citizens of quality who would be able to realise their responsibilities. He wanted that

the Parsi, the Christian and the Jew meet on common ground, for all come here as seekers of truth discarding all prejudices of the vulgar. They by that very search pursued in all sincerity and for the good of all mankind, draw nearer to Him who is the Lord of all Worlds, the Bountiful Creator of the Human Mind, the very source of knowledge and enlightenment. The university with its academic atmosphere, intellectual unity offers a better guarantee of national unity than does any other institution".

He was a great man when he gave expression to these ideas, but as a comparatively young and unknown servant of the Government of India, he expressed the same mature ideas in 1918 when he contributed an article to a volume on Indian Social Reform. He wrote: "I can conceive no nobler work to which an Indian can consecrate himself than that of cementing the heart of diverse races and nationalities of our vast continent into a solid and united whole, bound by a union that is not merely a superficial one that merely enables the Hindu and the Muslim, the Parsi and the Christian to regard each other on the sufferance or even with a spirit of benevolent neutrality, but a living and active union whereby they look upon each other as brothers working for the cultivation and progress of their common heritage".

The same idea was present in his mind when he established the Osmania University. Even the magnificent Buildings of the University are a concrete expression of his ideas of communal harmony–a harmonious blending of Hindu Muslim architecture.

In the matter of Secondary education in the State of Hyderabad, he was for the reorganisation of the whole education system. The Abbot scheme for vocational education and the Mackenzie scheme were drawn up at his instance. He was

On several occasions he presided over educational conferences and delivered addresses full of mature thoughts containing germs of truth not only for the times in which he lived but also for future generations.

His idea of education as I have already mentioned was the fusion of the two communities, the Hindus and the Muslims. Any educational scheme must be based on that principle. In the all-India Educational Conference at Calcutta he said: "It will not be the growth but the death of Indian nationalism if the Muslims of India fail to be impressed by the greatness of Asoka, Chandragupta or filled with pride and joy at the immortal frescoes of Ajanta and the sculptured monuments of Ellora, or fail to derive fresh inspiration from the glorious songs of Jayadev and Tukaram, or find food for deep and satisfying thoughts in the discourse of Sree Krishna and Gautama Buddha. It will not be the growth but the death of Indian nationalism if the Hindus are not filled with pride at the architectural splendours of the Monghols and the Adil Shahis, at the political achievements of great rulers like Sher Shah and Akbar, at the fine heroism of noble queens like Chand Bibi and Nur Jahan, at the liberal statesmanship of devoted ministers like Mohamood Gavan and Abdul Fazal, at the inspiration of poets like Amir Khusru and Galib. It will be a sad day indeed if the minds of Hindus and Muslims alike are not stirred with the high and noble aims of Viceroys like Mayo and Ripon, of administrators like Munro and Elphinstone, of friends of India like Fawcett and Bright, of missionaries like Hare and Miller. For all these and many more, whether Hindu, Muslim or Christian, loved India and worked for her."

Delivering the Punjab convocation address he defined clearly the aim of University Education when he said; "In our Universities the Hindu and the Muslim, the Sikh and

to India, the sometimes heart-breaking and always hard battles he may have had to fight against prejudice, blind conservatism and weakness, are not the kind of news that generally meets our eyes beneath the bold headlines in the papers and inspiring journalistic panegyrics. The result of a sound educational policy can only be judged by its results in succeeding generations. For an impartial and critical judgment, therefore, of Hydari's work in Hyderabad we must wait several years, though we have no doubt of the general tenor of the verdict". If the same writer were to write now he will confess that for the impartial judgment on the work of Sir Akbar Hydari he will not have to wait for the succeeding generation; it could be delivered now and the verdict of which he was so optimistic is real and true.

In the field of education Sir Akbar Hydari did not confine himself to local educational activities only. His interest in this matter ranged far beyond the borders of the State. He gave his moral and active support whenever it was possible for him to do so. "If the Osmania University was his favourite child, he was keenly interested also in the universities of Decca, Calcutta, Bombay and Aligarh. He was the president of the Mohammadden Educational Conference in 1917, and he played a prominent part in 1921 in countering the attempt of Brothers Ali to win over the Aligarh University to non co-operation. He was by 1925, as far as education is concerned an All India figure receiving praise as well as incurring condemnation from extreme Congress-men and also through his broadminded views from the extreme section of orthodox Muslims. He was made at various times, a fellow of Bombay, Decca and Aligarh Universities as well as of Osmania". The Oxford University impressed by his educational activities conferred on him the degree of Doctor of Laws.

imposed upon boys as the most receptive and impressionable age, they will never learn so readily again as they learn at the age of highest receptivity, when in our present system a foreign language is interposed between them and the knowledge they have to acquire".

These were his ideas before he proceeded to lay the foundation of the Osmania University. He was certain that knowledge could be assimilated thoroughly and quickly by means of the mother-tongue. Can any one deny this? His work in this respect was facilitated as he worked under a ruler wise, energetic and cultured.

Urdu is the medium of instruction in all the branches of the Osmania University. All the research work is done in Urdu and degrees are awarded. The idea that Urdu is not sufficient to express modern scientific thought has been falsified by the products of quality of this University. Dr. Raziuddin who has attained international fame is a case in point. There is only one Dr. Raziuddin now, but a time will come when many a Raman, Ali Imam and Tagore will go out of the portals of this University.

Once speaking of his unique experiment he said "Do not, I pray you, regard this movement or movements of this kind, as in any way separatist, provincial or sectarian. They are based upon the principle of national self-respect reverence .....cultural tradition which are not the insidious enemies but the strongest support of a nation in evolution".

Once a writer commenting on the great experiment expressed himself in the following words: "Rarely can the work of a great educationist be adequately weighed and measured in his life-time. Mr. Hydari's energy and enthusiasm, the silent labours of innumerable hours which he had devoted

Having these considerations to start with we would very briefly look into the educational activities of this "Versatile genius" who heralded a new era in Hyderabad.

In the domain of education Sir Akbar Hydari achieved that which would long be remembered and for which the coming generations would ever be grateful.

I must go back a little to associate Sir Akbar Hydari with educational activities. While he was the Examiner of Government Press Accounts (British India), he travelled widely throughout India and came in contact with many people and various aspects of Indian life. Slowly he began to conceive the idea that education in India must be on such lines that it should fuse the various creeds, castes and social units of the country into a homogenious one mutually helping one another. In all his educational activities this idea is all-pervading.

His monumental work in Hyderabad is the Osmania University. It was his long cherished desire that Urdu or in general terms the vernacular, must replace the English language. Speaking at the convocation of the Punjab University he said; "If you asked me what in my opinion constitutes the chief weakness of our present educational method, I would reply without the slightest hesitation that it is the employment of a language other than the student's mother-tongue as the principal medium of instruction. Proficiency in a foreign tongue, by which term I merely mean a language other than the boy's mother tongue without importing into it any other idea, proficiency in a foreign tongue is set before the youth of India as the main objective and the mark of education. The waste of mental energy, the double strain upon the young minds entailed by the process of instruction in a foreign language is enormous and irreparable, since it is

Sir Akbar Hydari - an educationist.

It is a sign of greatness when the word "great" is applied to the lives of men. But this term, very frequently, is vaguely and inappropriately used and it is for this reason that we should pause and ask ourselves as to what are the standards that justify the application of this term. A lot may be suggested. But one stands out most prominently. That the man who deserves this appellation must have exerted, by his work, a powerful influence on the minds of his contemporaries. If such a man really does some good in the generation in which he lives his work should be judged in relation to the circumstances of the time in which he lives. Judged by this standard none can dispute the right of the late Right Honourable Sir Akbar Hydari, Hyder Nawaz Jung Bahadur, Chancellor, Osmania University, Councillor and member of the Viceroy's Executive Council to be included among India's greatest personalities.

The late Sir Akbar Hydari's claim to greatness rests mainly on two things. Firstly his "broad-mindedness" and secondly "his ability to look ahead". In the first comes religion. He was a firm believer in Islam but this did not deter him from thinking and realising that others might justifiably and equally believed in the precepts of Hinduism, Christianity, Zoroastrianism and Buddhism. In the second came matters pertaining to education where he placed before himself the same principle. All his activities in the sphere of education were actuated by a sincere belief in the homogeneity of various social units of the country.

remain enshrined as a versatile financier in the hearts of his countrymen. His genius had won recognition outside the State also; referring to Sir Akbar, Lord Lloyd said at a meeting of the Central Asian Society in London that he very much regretted the impossibility of and exchange of chancellors of the Exchequer between London and Hyderabad. No nobler tribute could have been paid to him.

The period which has elapsed since Sir Akbar left the scene of his almost life-long labours in Hyderabad has been too short to enable any, save a privileged few, who were specially interested in his work or had to give effect to his policy, to arrive at a just estimate of his genius. As time passes, Sir Akbar's name will stand higher and higher in the sphere which he had made so peculiarly his own and as the rich fruit of his Herculean labours in Hyderabad is gathered in, we and the coming generations will realise more and more the great debt of gratitude under which Sir Akbar has placed us all.

SAEED AHMAD MEENAI,
IV Year Class.

than in a spectacular advance in expenditure.....Step by step as funds became available activities begun at first on a small scale have only been expanded, if justified in the light of-experience."

His policy of 'steady progress' and 'cutting the coat according to the cloth' was criticised as antique, orthodox obsolete and old, but it enabled the State to enjoy repeated surplus budgets without resort to fresh taxation and the potential revenue from income-tax, when the latter is imposed, still remains a reserve asset. Sir Akbar, instead of aiming at spectacular and theatrical results, strove to lead the State along the corridors of gradual and steady progress. As Nawab Fakhr Yar Jung said, "Within this steel-frame of prudent finance (Sir Akbar's) freest scope is allowed for the growth and development of the departments; and although the rules do not entitled a department to demand fresh allotments during the currency of a triennium, the Finance Department endeavours to meet any unexpected requirements that the department can justify."

From the very commencement of his tenure of office, Sir Akbar took the public into his confidence with regard to financial matters and he wonderfully succeeded in entirely re-organising the financial structure of the State, so as to render the State capable of weathering one of the grimmest storms of its age—the last Post-War economic depression. His policy was broad-based on the economic realities of the State and it found expression in the present wonderful financial structure of the Government.

He has handed down to us as a legacy some very helpful plans, e.g., the plan relating to the establishment of an economic board for formulating policies for rural revivification, industrial development and other economic problems—plans which Providence did not allow him to execute. He will long

	DEPARTMENT	1922 – 23	1939 – 40
1.	Education	59.33 Lakhs	101.40 Lakhs
2.	Agriculture	0.79 „	3.23 „
3.	Medical & Sanitation	15.79 „	32.37 „
4.	Veterinary	2.65 „	5.25 „
5.	Co-operative Credit	2.0 „	3.49 „

Some critics levelled at him the charge of treating Finance as a handmaid of Education, while some equally indiscriminate admirers vehemently refuted it, but Sir Akbar accepted it with pride, for he very well realised the value of the work he was doing. The establishment of the Industrial Trust Fund, which amounted to about a crore, the astounding expansion of Irrigation and hydro-electric work and the remarkable development of Sanitation, Co-operative Credit and Agriculture threw open for the State numerous fields of limitless development and prosperity.

The establishment of the State Bank, of which the pivotal position in the sphere of Hyderabad Banking and Currency is assured was the realisation of an idea, long cherished by Sir Akbar, to supplement the inadequate local facilities of Credit and Currency with the help of a Central Bank.

Sir Akbar's financial policy is most clearly pictured in his Budget Note for 1933 – 34. He observed, " It seems paradoxical that with revenues hard hit by the prevailing depression and without levying and extra burden on the tax-payer of the State, it has been possible for financial equilibrium to be maintained. It is due to two factors. One is that the expenditure of these dominions had not been geared upto a high level of taxation. The other and equally important factor has been that H. E. H.'s Government has ever since the beginning of this century believed in steady rather

and profit, is another notable financial achievement with which his name will ever be associated. Apart from the fact that this transaction is an enduring monument Sir Akbar's diplomatic capabilities, which enabled him to brush aside all political obstacles in his way, the purchase of the Railway has also opened new vistas of economic progress for the State. The more or less unchequered financial record of our Railway furnishes a great contrast to the dingy spectacle provided by some Railways in British India. Keenly alive as he always was to the interests of workers as well as to those of the tax-paying public, he adhered to a far-sighted policy which made our Railway yield steadily increasing profits year after year; few would believe that our returns were about 8% while those of Railways outside the Dominions were approximately 4·1 per cent.

But the most notable feature of his financial policy which won and deserved the praise of all thoughtful sections of the people, was that throughout his long and crowded career in Hyderabad, his sole aim was to make the national wealth flow in humanitarian, constructive and nation-building channels. Speaking at a Teachers' Conference once, he said, "I consider him to be a poor Financier who confuses his role with that of a banker and tries merely to accumulate money and build up big balances instead of seeing that the money that is taken from the people is rendered back to them with increasing profit for the organization particularly of nation-building departments."

The following table roughly indicates the amazing expansion of progressive activities of various Government departments during the long period our most illustrious Sovereign was graciously pleased to keep Sir Akbar at the helm of the ship of State.

The ear-marking of various funded investments as altogether separate reserves, was a far-reaching reform for which we are incalculably indebted to the genius of Sir Akbar. With a view to repaying the public debt, soon after assuming charge of the Finance portfolio, he established a sinking fund, known as the Debt Redemption Reserve, which, in 1940, amounted to Rs. 3,37,53,768. Sir Akbar was fully alive to the vital necessity of making provision against famines in Hyderabad and he built up the Famine Reserve Fund, to which an annual contribution of Rs. 15 lakhs is made unfailingly. At the end of his career, this fund amounted to Rs. 2,93,37,688. Similarly, the industrialisation and commercial advancement of the State was very close to Sir Akbar's heart and the setting aside of Rs. 219,15,561 as an Industrial Trust Fund heralds the dawn of a new era – an era of commerce and industry and the increased prosperity which follows in their wake. The main purpose behind the establishment of the Osmania Sicca Reserve, was to stabilise the exchange ratio within set limits. This gigantic reserve, which amounted to about Rs. 361,622,341 when Sir Akbar left our State to work in a still wider sphere, was solely built up of the profits of coinage. Similarly, Sir Akbar established a Paper Currency Reserve of about 5 crores and this is proving itself a very vital factor in the stability of the Hyderabad note issue. The deposits in General Reserve which total about Rs. 64 lakhs are ample to meet any demands that may be made on Savings Banks. Insurance and Provident Funds and the various departmental Reserves which conduce to the smooth working of different major departments, are further evidence of the outstanding financial genius of Sir Akbar.

A close study of the sources of revenue and expenditure reveals Sir Akbar's rare financial policy. The purchase of about twelve hundred miles of Railway on April 1, 1930, some forty-five months prior to the expiry of the lease, at a cost of £ 1·3 millions, which eventually resulted in immense economy

developments or precedents, and subject also to a rigid and really effective audit. The department must carry out whatever measures of reform it might desire to institute within this grant. If it happens to have any proposals for capital expenditure, it must provide within its grant, for the amount of interest charges, incurred by the State in financing it. If, after such allocations of the ordinary income among the different departments and making due provision every year for the formation of specific reserves for such classes of expenditure as, like famine, come inevitably after a cycle of years, there happens to be a surplus, it would be the happy privilege of the Finance Department to suggest how that surplus could be most profitably distributed."

The previous centralised system discouraged enterprise, because no department knew beforehand how large a grant would be made to it in a given year and, apart from this, the policy of granting most to that department which cried most, was not sound in all cases. The Departmentalisation scheme was sanctioned with a few trivial amendments and is proving itself a great blessing. On the one hand, it grants a reasonable share of autonomy to the departmental officers to execute their plans smoothly and, on the other, minimises the risk of waste and thus conduces to the building up of stable reserves for productive and constructive activities. It paves the way for bolder economic enterprise; it encourages different Government departments to draw up carefully thoughtout constructive programmes and, by making the fruits of the economy and caution of a particular department available for the same department, restrains hasty expenditure. Far-sighted as Sir Akbar was, he retained the right of reduction in the contract grants in periods of extreme financial stringency but there has been no occasion for the exercise of this right. On the contrary, his policy invariably was to sanction extra expenditure for really constructive purposes.

view to absolutely eliminating hand-made coins. During the decade 1900–1910, the revenue and expenditure averaged approximately Rs. 449 and Rs. 376 lakhs per annum respectively, and a debt of about Rs.225 lakhs was completely wiped off. A gigantic contribution of Rs. 129 lakhs was also made to the cash balances of the State. In the year 1910, Sir Reginald Glancy became the Finance Minister and all along his career, prices were steadily on the increase; hence the average annual income and expenditure in the decade 1910-1920 amounted to Rs. 594 lakhs and Rs. 554 lakhs respectively. A further addition of Rs.221 lakhs was made to the cash balances.

It was at this juncture that Sir Akbar took the reins of the Finance Department into his gifted hands and it is a matter of unique pride that he stands first in the line of Finance Ministers of extremely outstanding talents and that it was not in an altogether unploughed field that his indisputable financial acumen bore fruit. The long strides taken during his tenure of office brought about a revolution in the domain of Hyderabad finance and there is not a single aspect of State finance which does not bear his unmistakable impress.

But by far the greatest monument to Sir Akbar in the realm of finance at Hyderabad is the Departmental System and on it, in fact, rests his claim to lasting fame. This has, today, become so integral a part of our financial system that it calls for no further emphasis or explanation. The eloquent words of Sir Akbar's first Budget Note, presented in 1922, vividly portrays this highly scientific system: "The policy that suggests itself to me as the best at present for adoption, is to fix the total grant of each department for a number of years and give it a large measure of autonomy within that grant, subject, of course, to such general restrictions as are necessary to avoid any undesirable

diture continued to rise. The State had practically lost all credit in the money market and money could only be borrowed at ruinous rates of interest and with the help of very substantial security. Owing to the constant and uniform deterioration of the credit of the State, whole districts had fallen into the clutches of moneylenders, who strained every nerve to retain possession of them. A favourite dodge to achieve this end, was to keep the accounts in a very involved state, so as to prevent the Government from shaking off the usurers' strangling hold on it; the money spent in unproductive activities was very large, while nation-building departments were practically starved.

This gloom was suddenly dispelled by the beacon-flash of the genius of Sir Salar Jung I, who succeeded, after ceaseless labour, in carrying out comprehensive reforms in 1855. With the assistance of a committee of two financial experts, he met with amazing success in raising the credit of the State, lightening the crushing burden of debt and interest, redeeming several mortgaged districts, reforming the antique and backward systems of records and accounts, introducing the budgetary system and last but not least in significance, establishing district treasuries.

At the close, however, of this golden era of Hyderabad Finances in 1883, the financial position remained unstable and shaky till that calamitous catastrophe - the great famine of 1900, when the State Budget showed a deficit of 144·47 lakhs and a heavy loan of about 340 lakhs had to be taken from the British Government.

There was a further deficit of 75·94 lakhs in 1902, the year when Sir Casson Walker took the finance portfolio into his capable hands and being alive to the fundamental short-comings of a hand-made currency, immediately took steps for the establishment of an up-to-date mint, with a

ture on printing ultimately resulted in the creation of the Controllership of Printing and the appointment of a separate commission. This, together with the fact that the splendid system of press accounts introduced by Sir Akbar still holds the field against the systems advocated by a generation of more noisy financial experts, is the foundation on which the fair fame of Sir Akbar as a financier is broad-based.

In October 1905, his services were placed at the disposal of H. E. H. the Nizam's Government which appointed him Accountant-General. Towards the close of 1906, he was made Financial Secretary and from April to October, 1907, most ably officiated as Finance Member in place of Sir Casson Walker, when the latter proceeded on leave. This period was also characterised by numerous reforms, which are apt to escape our notice in the blinding blaze of his later unparalleled achievements. In 1920, of his own accord he reverted to British service and was reposted to Bombay as Accountant-General, but the very next year our August Ruler, than whom there is no better judge of men, reappointed Sir Akbar as Finance Member in succession to Sir Reginald Glancy.

Before enumerating Sir Akbar's achievements in matters financial, a hurried retrospective glance at the financial history of Hyderabad will be of help in arriving at correct conclusions.

The financial history of Hyderabad in the Nineteenth Century, except for the period when Sir Salar Jung the Great was at the helm, is characterised by an utter lack of system and by a uniform gloom. The epoch prior to the appointment of Sir Salar Jung was the gloomiest and marked by utter confusion. There was no public treasury and records relating to revenue and expenditure were almost unknown. Revenue was steadily on the decline, while expen-

Sir Akbar Hydari as a Financier.

The passing away of a great figure like Sir Akbar at a critical moment, when the war has completely encompassed the whole world in its deadly coils and India has to weather one of the most terrible blizzards of its history, is a loss of the greatest national magnitude. But his immeasurable work and proud achievements in the realm of finance at Hyderabad, have fittingly won him a conspicuous position in the galaxy of masterminds, whence he will always shed a guiding light, to prevent his successors being wrecked on the shoals and rocks with which the treacherous waters of high finance are studded. Throughout his active life as a financier, he laboured, unremittingly and with enthusiasm, to think out and give practical and concrete shape to those far-reaching financial reforms, which today constitute the most enduring monument to his memory.

At the early age of eighteen, Sir Akbar appeared for the Government of India Finance Examination and though that modesty, which was so charming a trait of his character, precluded his entertaining any very high hopes of success, yet his extra-ordinary capabilities enabled him to emerge triumphant and to stand first in the order of merit. Thus this myriad-minded genius entered his field of boundless activity, with eyes actually clouded with tears. His financial acumen soon bore fruit and in a short time he was promoted to the post of Examiner of Government Press Accounts. This provided him with ample opportunities of accumulating experience - so vital and profound that all along his career, his peerless judgment was never at fault or known to waver in the realm of finance, or any other sphere of human endeavour. As examiner, Sir Akbar soon made his mark; his brilliant suggestions concerning expendi-

MANAGING COMMITTEE

OSMANIA MAGAZINE

1942—43.

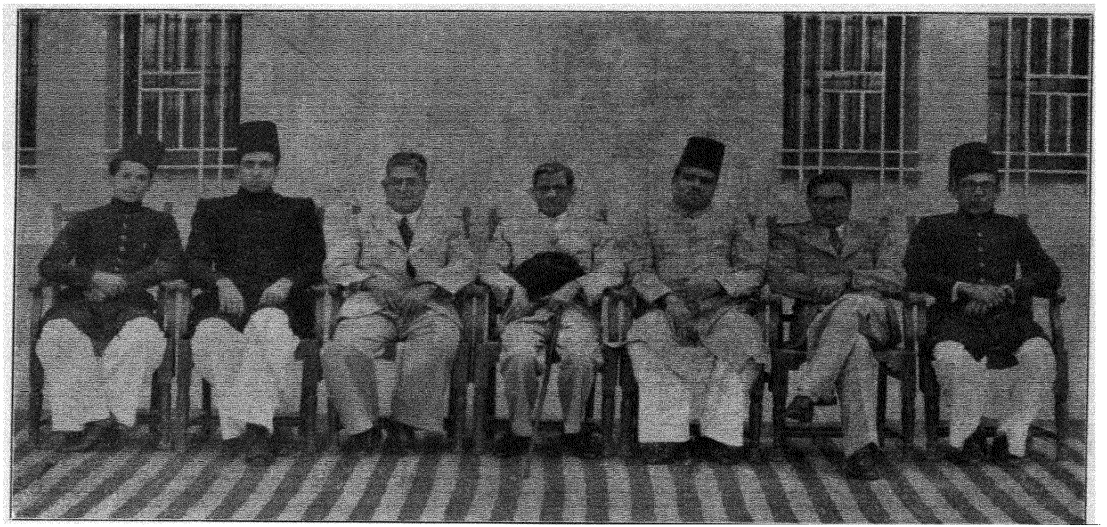

From Left:—(1) Mr. Mir Hamid Ali
Asst. Editor English Section.

(2) Syed Ali Mohamed Moosvi
Secretary, Managing Editor & Editor English Section.

(3) Prof. Wahidur Rahman
Hon. Treasurer.

(4) Prof. Qazi Mohamed Hussain
Pro-Vice-Chancellor.

(5) Dr. Syed Mohiuddin Qadri Zoar
Adviser Urdu Section.

(6) Mr. V. S. Krishnan
Adviser English Section.

(7) Mr. Syed Mohamed Ashad Khan Razvi
Editor Urdu Section.

Sir Akbar Hydari's association with the Medical and Public Health Department has been a very happy and beneficial one for the advancement of public health in the State as a whole. His unceasing efforts and constant zeal in the advancement of science and providing amenities for raising the standard of life and health are too well known to need any elaboration. It has been possible to provide modern hospital accomodation and equipment in many of the district towns and to introduce special institutions like the T. B. clinic, etc., in Hyderabad City. Sir Akbar's efforts contributed not a little towards the construction of the T. B. Sanatorium now in progress. The status and prestige of the Medical practitioners has not only been enhanced but given proper recognition by his inauguration of the Hyderabod State Medical Council, in the formation of which he took keen interest.

Sir Akbar's endeavours to secure proper students for the European Scholarships have borne fruit and in consequence of this we now find so many highly qualified mulkies available in Hyderabad. He was the originator and founder of the Osmania University. He undertook this experiment which was the first of its kind, with great courage, fore-sight and fortitude, as it was considered impossible to have a University with a vernacular language as the medium of instruction. This has not only resulted in an University which imparts training in various faculties in the Urdu language, but the Urdu language itself has been considerably enriched by the University.

(Sd.) M. HYDER ALI KHAN,
F. R. C. S. E,

memory left behind in Hyderabad will testify to all this better than what I say.

He was greatly loved by those that came in close contact with him and this is the final test of a man's worth. His family affection was a romance in itself and an example to others.

In association with one of the keenest intellects he had an affectionate and deeply religious and spiritual nature. I am glad to have the opportunity to pay this tribute in the memorial number of the Osmania Magazine.

Thyagarayanagar,
Madras, 23-1-43. } (Sd) C. RAJAGOPALACHARI

HYDERABAD, DECCAN.
24th February 1943.

"It is in the fitness of things that the students of the Osmania University should devote a special issue of the Osmania Magazine to the memory of their late lamented Chancellor. The University owes much to Sir Akbar from the time of its foundation and through all the stages of its progress as an experiment and Sir Akbar was fortunate in having lived long enough to see it grow out of the experimental stage and emerge as one of the great institutions in India. I know that he continued till the last to take a personal interest in its development and, even in distant Delhi, never ceased to enquire about it. There was no work which he undertook to which he did not devote his fullest energy and indefatigable labour but the University was his special favourite and his best thought and attention were given to it. Today the University bears ample testimony to its own usefulness and the greatness of its conception".

(Sd) ALI YAVAR JUNG

HYDERABAD DECCAN.
17th February 1943.

The late Sir Akbar Hydari was one of the men with the finest brains that I have ever met. In addition to his great ability he had a marvellous faculty for hard work. He spared no pains. I have often seen him hard at work during serious illness and also during long journeys. He devoted his labours to the good of the State which he served both ably and well. The results of his services to Hyderabad may be seen in material shape in the Osmania University, and in our splendid Public Roads, Drainage, Wireless and Aviation. But perhaps his greatest achievement was to have Hyderabad recognised as a leading and enlightened State in the counsels of the Empire both in England and in India. He had his human failings too, but his merit can justly be said to have out-balanced these, and his name will go down to posterity as a man who performed valuable service for Hyderabad. His outstanding merit was recognised by the Oxford University which conferred on him the Honorary degree of D. C. L. and also by the British Cabinet which made him a Privy Councillor. These honours have been attained by very few Indians.

(Sd.) MAHDI YAR JUNG

Sir Akbar Hydari and I met and became friends when both of us were advanced in years and our friendship was rather intense. It became one of those intimate things that one likes to keep from the public gaze.

Sir Akbar was great in administration. He hated conflict and loved peace and knew how to compose differences. He was passionately interested in art and culture. The

Messages

FROM HIS EXCELLENCY
THE PRESIDENT H. E. H. THE NIZAM'S
EXECUTIVE COUNCIL.
16th February 1943.

Sir Akbar's contribution to the establishment of the Osmania University and his services in making the University a shining success will long be remembered by all those in Hyderabad and elsewhere who have at heart the progress and development of Urdu as the national language of India. Sir Akbar has left the impress of his great personality on every aspect of the development of the University and I am glad that its students propose to recall and honour his memory by the publication of a special supplement of the Osmania Magazine".

(Sd)

As a very old friend of Sir Akbar and his colleague over a long number of years, I rejoice in the thought that you have decided to issue a special Number of your Magazine to recall the memory of your late Chancellor. I am personally aware of what the University meant to Sir Akbar and the devotion and care which he bestowed on its problems and on all matters relating to your welfare. Prodigious labour and untiring perseverance were the key-notes to Sir Akbar's character and these he showered on the University. Apart from all the other attributes of knowledge and character which you will no doubt acquire, these two qualities are in themselves worthy of emulation by you, added to which Sir Akbar's devotion to duty will, I am certain, provide similar inspiration to all.

(Sd) AKEEL JUNG
D/ 22 - 5 - 52 F.

Thanks : -

It is a great regret for us to be deprived of the services of Mr. V. S. Krishnan whose long experience and genteel manners were enough to attract the whole student community. We are glad indeed to find him in a higher position at Nagpur. Now, let us welcome our new adviser Mr. M. S. Doraiswami whose un-tiring zeal, knowledge and sympathy towards the students have fittingly won a place for him in their hearts.

Our colleagues of Sections Urdu and English have done their utmost to give us all assistance in the running of this issue.

It would not be out of place to mention our Registrar Dr. Syed Hussain, his 1st Asst. Mr. Mazharullah and Proctor Mr. Syed Abdul Majeed Siddiqi who are always in close contact with the students giving them proper assistance in all difficult matters. They really deserve our congratulations. We are also thankful to Dr. Zoar and Prof. Wahidur Rahman.

We should like here to express with profound joy the debt that we owe to our amiable Pro-vice-Chancellor who has responded to our appeals made in the last issue with regard to the students taking practical part in politics. It should be noted that our gratitude to the P. V. C. is something more than a formal and conventional tribute. What we owe to him for his bounteous love to us displayed times without number, is deeper than we can easily put into words.

"A successful termination is itself a prize of a man's labour and sincerity." (Hazrat Ali.)

SYED ALI MOHAMED MOOSVI
(M. A. final)
Managing Editor and Editor, English Section.

tionary conceptions. To take arms against government is really a crime to a student. Let us, therefore, request you to stand aloof from subversive activities, do your part in the furtherance of culture and civilization and strictly adhere to your education. This is what we are lacking.

War :—

Why is this war raging in the whole world? Why is the complete destruction of the totalitarian states urged and liked ? Nor is this all. What part are we to play in the theatre of blood and death? Such questions are natural and inevitable even for young and ardent minds, the hope and promise of the future generation. All over the World where ever there are free men and women, the desire for the defeat of the Axis Powers is passionate and profound Why? The only answer is the safe guarding of certain fundamental principles of civilization——the rule of law against the law of the jungle the right to freedom of the mind against the power of out-laws to control the direction of thought, the co-operation of Nations by way of free association instead of by coercive subordination. These are the war aims of the Allies. What more is needed? The honest and frank declaration of the Atlantic Charter in which some amendments were later on introduced, will mark a glorious page in the annals of mankind.

We have made a fore-cast in the last issue that one day or other the Russian Morale, invincible, indefatigable and assiduous in its nature, would drive back Nazi Armies. It has become a fact now. The success of the Eighth Army in North Africa is not less hopeful and stimulating than that of the Red Army in Russia. We have given a death blow to Japan in the Pacific. The initiative has passed into our hands. The defeat of Hitler and his associates is the price of our freedom, the destruction of the Axis Powers is the value of our victory and the complete collapse of our enemy will open vistas of immense joy and prosperity.

Nawab Ali Yawar Jung Bahadur and Dr. Hyder Ali Khan have earned our gratitude by acceding to our request to send us a message for this Number.

Articles :—

We have collected articles from students as well as some great officials who have studied the life and character of our late lamented Chancellor whose last appearance in the University will be ever green and fresh. The articles on Sir Akbar as Financier and as Educationist and his Memoirs are to be read, as they throw light on the financial abilities and educational schemes and on his lofty personality. Mr. Liakatullah, Mr. K. M. Ansari and Prof. Kesava Iyengar need no introduction to us. They have contributed articles of great importance which demand attention of readers foremost. We are obliged to them for their compliance with our request. Mr. Baqi has chosen, a wonderful topic entitled "A great Man whom I never met," in which he has shown the essentials of genius and greatness qualities abundantly possessed by our late Chancellor.

Hostels :

It is of the utmost importance to be always in touch with the activities of the various hostels attached to the University. In a residential University like ours, the hostels are truly a second nursery for the students. It is therefore necessary that true ideals of co-operation, of service and of devotion, to our gracious and noble King should be cultivated in the communal life of the hostels.

Students' Community :—

The era of democracy is an era of individual development. Man is naturally of a progressive temperment of mind, liberty and equality join hands. But, it does not mean thad these inheritors of the French Revolution may superseut other rare qualities of men. We condemn our right revole-

Sir Akbar Hydari :—

It is a bold and sincere attempt to foster the feelings of universal brother-hood among the students of that Alma Mater with which the name of Akbar Hydari will be connected. Generations of Hyderabadis ought to be indebted to one who was the Father of Enlightened Hyderabad.

When we proposed the publication of the Hydari Number, bitter opposition was offered by our Colleagues, but our thanks are due to the Pro-Vice-Chancellor who permitted us to realize our cherished desires, this Special Number is seeing the light of day.

This is our humble offer to the memory of one who is no more, but whose life and character like a clarion call, with a majestic sound, will suffice to lead the students to success, glory and all that they desire.

Messages :—

We are very grateful to our Chancellor, His Excellency Nawab Sahib Chattari for the trouble he undertook to send us a message. We should like to register here our special obligations to Nawab Akeel Jung Bahadur, Vice President of the Executive Council for the vivid picture of the adorable personality of Sir Akbar Hydari. Nawab Mehdi Yar Jung Bahadur has earned our affectionate gratitude by responding to our appeal for a message. As a Vice Chancellor and a man of great capabilities endowed with rare qualities which, few can claim, he always assists students and gives proper advice and genuine guidance. His message conveys that love, that honour and esteem with which he respected Sir Akbar.

We are highly indebted to Mr. C. Rajgopalachari Ex-Premier of Madras for his prompt reply and a kind message which, we are sure, will please our readers.

The Editor Advocates.

The 15th year of the Magazine comes to a successful end with the special Hydari Number which shows the esteemed love, great popularity and enviable career of the Mastermind, Right Hon'ble Sir Akbar Hydari—Privy Councillor, President, Chancellor, and Affectionate Father of 'Osmans.' We are happy at the fulfilment of the duties entrusted to us by our colleagues. A word of thanks with profound love is our only return for their kindness and confidence.

Our period was full of difficulties and obstacles; still we are happy not because of our success in conducting the Magazine, but of that honour, that sincerity and that co-operation which is the greatest encouragement to a Managing Editor.

We congratulate the coming editors and shall expect them to keep up the high traditions and tone of the Magazine. An editor has to deal with delicate problems in a tactful way with impartiality and sincerity.

An Honour

For the first time, in the annals of the University, our Sovereign Master whose towering personality enjoys a unique and highly respected place among the Modern Rulers, has honoured the 'Osmans' for their commendable behaviour shown by discarding agitation and un-lawful political meetings for which His Excellency the Viceroy sent a congratulatory telegram to our Sovereign. The more we think of this honour, the greater is our joy and satisfaction, mingled, of course, with inexpressible gratitude to the sacred soul embodied in Sultanash-shoera, Jalalatul Malik the Nizam of Hyderabad and Berar.

M. S. DORAISWAMI ESQ., B. A. (Oxon). M. A., L. T., (Madras).
Adviser, English Section.

CONTENTS

		Page
1.	The Editor Advocates	i
2.	Messages	vi
3.	Sir Akbar Hydari as a Financier *Saeed Ahmad Meenai, IV Year Class*	1
4.	Sir Akbar Hydari - an educationist, *Mir Sujjad Ali M. Ed. (Osman)*	11
5.	Some close glimpses of Sir Akbar Hydari, *M. Liakatulla, Finance Secretary*	20
6.	A Great Man whom I never met, *M. A. Qayyum Khan Baqi M. A. (Osman)*	24
7.	Sir Akbar Hydari - An Appreciation, *K. M. Ansari, Political Secretary.*	29
8.	Sir Akbar Hydari - A Memoir, *Shahid Ali Khan, Senior B. A. Class.*	32
9.	Akbar Hydari - the Mystic Architect, *S. Kesava Iyengar M. A. Professor of Economics (Nizam College)*	40
8.	Our Benevolent Chancellor, *Syed Ali Mohamed Moosvi. M. A. (Final)*	43
9.	College News, *Mir Hameed Ali, B. Sc. (Osman) Asst. Editor, English Section.*	45

Dedicated

with affection and gratitude to the Memory

of the

Late Sir Akbar Hydari.

Annual Subscription.

		Rs.
1.	Present Students, Osmania University....	4
2.	Old boys, Members of the Teaching Staff	5
3.	General Subscribers	6
4.	Single Copy	2

Note—Registration and V. P. Charges Extra.

Can be had of :

OSMANIA MAGAZINE OFFICE
OSMANIA UNIVERSITY
HYDERABAD-DECCAN.

The Osmania Magazine

Vol. XV. No. 3

ADVISORY BOARD

President :
Qazi Mohamed Husain, Esq., M.A., LL.B., (Cantab), Pro-Vice-Chancellor.

Adviser, English Section :
M. S. Doraiswami Esq., B.A., (Oxon), M.A., L.T., (Madras).

Adviser, Urdu, Section :
Dr. Syed Mohiuddin Qadri Zore, M.A., Ph.D. (London).

Honorary Treasurer :
Professor Wahidur Rahman, B.Sc.

MANAGING COMMITTEE
1350 - 1351 F.

President :
Qazi Mohamed Husain, Esq., M.A., LL.B., (Cantab), Pro Vice-Chancellor.

Adviser, English Section :
M. S. Doraiswami Esq., B.A., (Oxon), M.A., L.T., (Madras).

Adviser, Urdu Section :
Dr. Syed Mohiuddin Qadri Zore, M. A., Ph. D. (London)

Honorary Treasurer :
Professor Wahidur Rahman, B.Sc.

Secretary :
Syed Ali Mohamed Moosvi, M.A., (Final).

(*Managing Editor & Editor, English Section* :)
Mr. Aqil Ali Khan, M.A., (Osman).

(*President Students' Union* :)
Mr. Syed Mohamed Ashhad Khan, B.A., (Osman).

(*Editor, Urdu Section* :)
Mr. Mohamed Shoebullah Khan.

Mr. Mir Hamid Ali, B.Sc. (Osman).
(*Asst. Editor, English Section* :)

HYDARI NUMBER

OF THE

OSMANIA MAGAZINE

BEING

THE JOURNAL OF THE STUDENTS

OF

THE OSMANIA UNIVERSITY

HYDERABAD-DECCAN

MANAGING EDITOR & EDITOR, ENGLISH SECTION

SYED ALI MOHAMED MOOSVI, M. A. (Final)

ASST. EDITOR:

MIR HAMID ALI, B. Sc., (Osman)

Vol. XV. 1942 No. 3

Printed by

CHEEKOTY VEERANNAH & SONS,

SECUNDERABAD-DN.

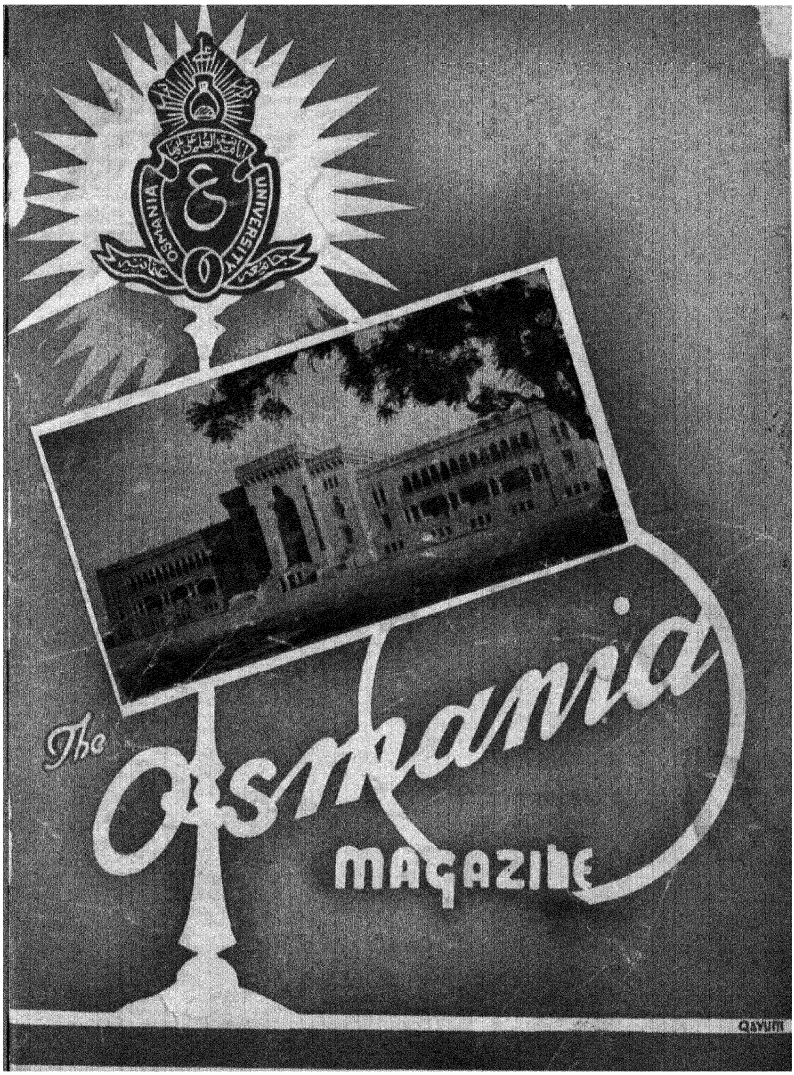

anaging Editor, & Editor, English Section
SYED ALI MOHAMED MOOSAVI,
M. A. (Final)

Asst. Editor:
MIR HAMID ALI
B. Sc., (Osman.)